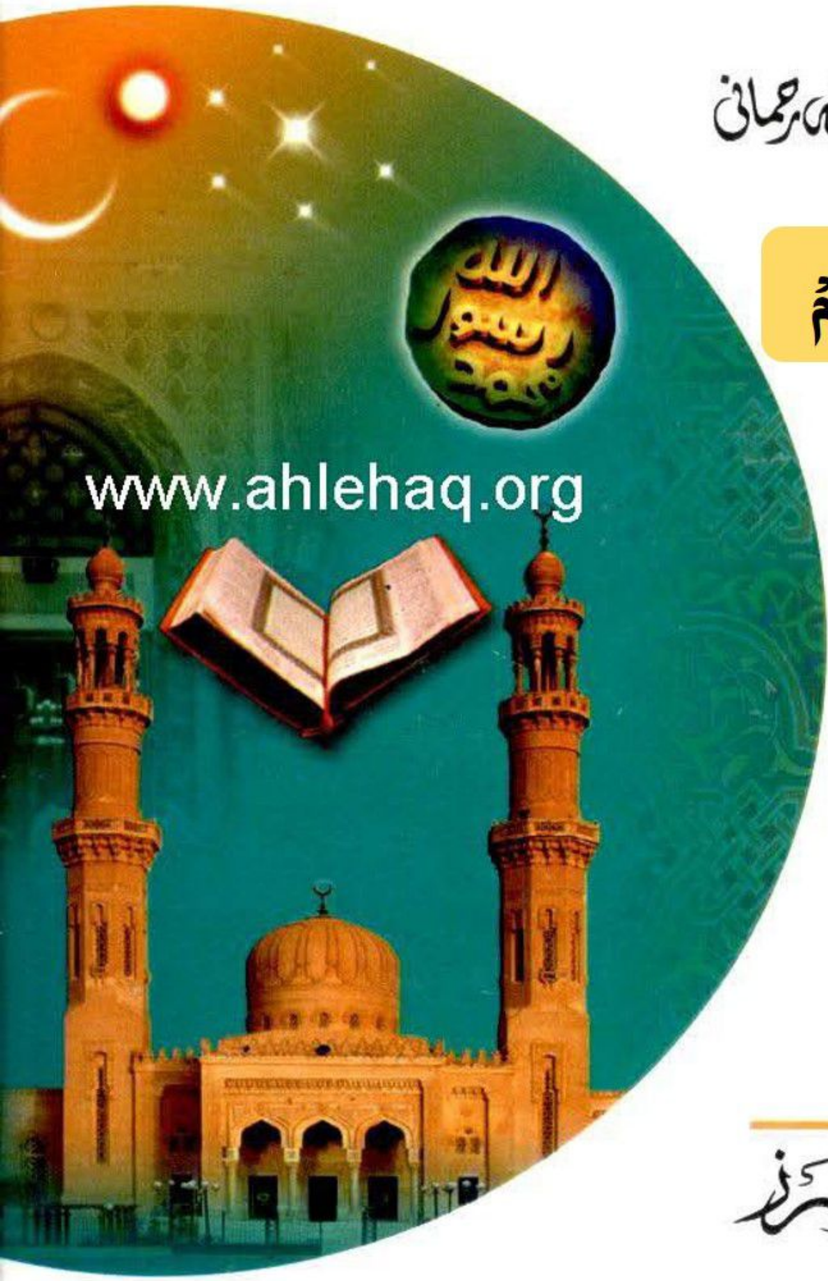
راہِ عمل

۱۔ نقوشِ موعظت
۲۔ حقائق اور غلط فہمیاں
۳۔ نئے مسائل، اسلامی نقطۂ نظر

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جلد چہارم



زمزم پبلشرز

راہِ عمل (۴)

عصرِ حاضر کے سماجی مسائل

مغربی ثقافت کے غلبہ اور اسلامی تعلیمات سے
دُوری کی وجہ سے موجودہ حالات میں جو سماجی مسائل پیدا
ہو رہے ہیں اُن پر بصیرت مندانہ تبصرہ اور رہنمائی۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

راہِ عمل

کتاب کا نام ——— عصرِ حاضر کے سماجی مسائل

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel . 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
Bl1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، وہ کتنی ہی قرابت مندیوں اور رشتہ داریوں کی ڈوری سے بندھا ہوا ہے، ان ہی رشتوں سے خاندان وجود میں آتا ہے، اور کئی خاندان مل کر جب ایک جگہ قیام کرتے ہیں تو اس سے سماج کی تشکیل عمل میں آتی ہے، سماج میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے لوگ بھی، وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جو راہ راست پر مستقیم ہیں، اور وہ لوگ بھی جو صحیح راستہ سے منحرف ہوگئے، اس لئے سماج میں اچھے اور برے دونوں طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔

ان واقعات کا انسان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، اور انسان چاہے نہ چاہے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس سے الگ نہیں رکھ سکتا، اس لئے آج اصلاح معاشرہ اور سماج سدھار کی آواز ہر طرف سے اٹھ رہی ہے، اور کتنی ہی مقامی، ملکی اور بین ملکی سماجی تنظیمیں ہیں، جو میدان عمل میں اتری ہوئی ہیں، لیکن ایک حقیقت ہے کہ خدا کے یقین، خدا کی بھیجی ہوئی شریعت کی پیروی اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے بغیر سماج کی حقیقی اصلاح نہیں ہوسکتی، اس کے بغیر جو کاوشیں کی جاتی ہیں، ان کی مثال درخت کی جڑ کے بجائے اس کے تنوں اور ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسی پس منظر میں راقم الحروف روز نامہ ''منصف'' کے کالم شمعِ فروزاں میں سماجی مسائل کو خصوصی اہمیت دیتا رہا ہے، بحمد اللہ لوگوں نے نہ صرف اسے پسند کیا، بلکہ بہت سے رسائل وجرائد اسے نقل بھی کرتے رہتے ہیں، اب یہ مستقل مجموعہ کی شکل میں قارئین کی نذر ہے، خدا کرے یہ کم سواد تحریریں سوئے ہوئے دلوں کو جگانے اور غافل اذہان میں فکر کی چنگاری سلگانے میں کچھ کامیابی حاصل کرسکیں۔ وباللہ التوفیق۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرضِ مرتب

انسان طبعی طور پر معاشرت پسند واقع ہوا ہے، چنانچہ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ لوگ کسی کالونی یا شہر کو مکمل طور پر آباد نہیں کرتے تھے، بلکہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، اس زمانہ میں بھی لوگ اپنے خاندان اور متعلقین کے ساتھ رہتے تھے، پھر جب رفتہ رفتہ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا، دنیا نے تمدن کو اپنایا تو سماج اور سوسائٹی وجود میں آئی، ظاہر ہے یہ سماج حضرت انسان کے وجود سے ہی آج تک قائم ہے، جس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خیر وشر دونوں طرح کی خصوصیات رکھی ہیں، کبھی تو وہ رشک فرشتہ بنتا ہے، اور کبھی وہ شیطان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انسان کی نیکی و بدی کی یہ صلاحیت انفرادی زندگی کے مقابلہ اجتماعی زندگی میں بہت جلد ترقی کر جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نیک کام یا برا عمل کوئی شخص تنہا کرے، تو سوسائٹی میں اس کا اثر جلد نہیں ہوتا ہے، لیکن جب کسی معاشرہ میں بہت سے لوگ ایک ساتھ مل کر کسی خیر یا شر کا کام کریں تو سوسائٹی اس سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے انسانی سماج میں آج کے زمانہ میں خیر اور بھلائی کے مقابلہ شر اور برائی روز افزوں ترقی پر ہے، مغرب کی ایجاد کردہ بدتہذیبی اب مشرقی ممالک کے لئے تہذیب بنتی جارہی ہے، اور مغرب کی جانب سے چلنے والی ہر ہوا

کے جھونکے کو مشرق اب بادِ نسیم تصور کرنے لگا ہے، پھر یہ مسائل ایسے نہیں کہ اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ہو رہے ہیں، بلکہ ہر انسان جس کے سینہ میں دل اور دل میں ضمیر ہو، اب یہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہو گیا ہے، اور اس سے کڑھن محسوس کر رہا ہے، خود بخود جو سماج میں برائیاں کیا کم تھیں، مگر مغربی تہذیب نے تو اس کا گراف اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کی شخصیت علمی و دعوتی حلقوں میں محتاج بیان نہیں، اللہ تعالیٰ نے علمی گہرائی و گیرائی، فکری اعتدال اور زمانہ آگہی، کے ساتھ ساتھ انہیں زبان وقلم اور تعبیر وتشریح کا بے پناہ ملکہ دیا ہے، مشکل سے مشکل تعبیر کو آسان سے آسان تر انداز میں بیان کرنا آپ کا امتیاز ہے، ادھر تقریباً چھ سالوں سے روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن میں ''شمع فروزاں'' کے کالم میں ہر ہفتہ آپ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خصوصی کالم تحریر فرماتے ہیں جو بصد شوق زبان و بیان کی چاشنی اور معنویت کی وجہ سے پڑھے جاتے ہیں، اور عوام وخواص دونوں میں یکساں رہنمائی کی جاتی ہے، اس کالم میں سماجی مسائل سے متعلق بھی بہت سی تحریریں آپ کے قلم سے نکلی ہیں، جو عصر حاضر میں پیدا شدہ سماجی مسائل کے اسلامی حل کی رہنمائی کرتی ہیں، احقر نے ان مسائل کو ''منصف'' کی قدیم فائلوں سے جمع کیا ہے، اور اب یہ مجموعہ ''عصر حاضر کے سماجی مسائل'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس مجموعہ میں اکثر اہم سماجی امراض کی طرف نشاندھی کی گئی ہے اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا علاج

بھی بتایا گیا ہے، یقیناً یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں پڑھی جائے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو امتِ مسلمہ بلکہ انسانیت کے لئے نفع بخش بنائے اور قبولیت سے نوزے، اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ مدظلہ کا سایہ تادیر بصحت و عافیت قائم رکھے، اور مؤلف کے ساتھ ساتھ راقم الحروف کو بھی اس کے اجر میں شریک کرے۔

۱۷شعبان ۱۴۲۵ھ

محمد نعمت اللہ

۲رستمبر۲۰۰۴ء

(ریسرچ اسکالر: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

قانونِ شریعت ـــــ رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات، جذبات، مصالح و مفاسد اور عادات و اطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا، اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اُصولِ زندگی اور جتنا مناسب قانونِ حیات وضع کر سکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کر سکتی، نظامِ زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لئے قوتِ فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے۔ ''اَلَا لَهُ الْحُكْمُ'' (انعام:۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا، کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا اور اس سے اس بات کی بھی اُمید نہیں کی جا سکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیت انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لئے خدا کے رب اور رحمٰن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گذارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جارہا، اسی کو ''شریعت'' کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس عہد میں تشریف لائے جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا، اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں، لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعتِ محمدی اس وقت دُنیا میں آئی جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام ''اکمالِ دین'' اور ''اتمامِ نعمت'' ہے۔ (مائدہ:۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے جو ''شریعتِ اسلامی'' یا ''اسلامی قانون'' کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض ''نظریہ'' نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام و نشان کردے، بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم و بیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا ہے، دنیا

میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن وسلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافتِ عثمانیہ ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا، لیکن آج بھی دُنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن وسلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی حساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیاء وافریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ممالک کو تو عرصہ سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جارہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن وامان اور قانون وآئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتہ پہلے اچانک وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن وحدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائیگا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں، لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں وہ پرسنل لا تک محفوظ نہیں جس کو کسی نے کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی گرتی ہوئی

ساکھ کو اونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانہ بھی یہ بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی، جے، پی گورنمنٹ جو خود رام راج کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ''ڈراؤنی'' چیز ہے، حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن و امان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی، کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُمورِ خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی، کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق و فرائض کی تعیین میں افراط و تفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی، اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دی، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط و تفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعتِ اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط و تفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود

قصاص کے قوانین جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنی ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، پکوان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے، لیکن بھوک و پیاس جیسے پہلے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کہ جگہ ایٹم بم اور میزاء بنالیا ہے، لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی یہی حال زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہن اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے، اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ کہ آج دنیا کا کوئی ایسا قانون نہیں جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی

قانون میں تو اسلامی قانون سے اتنا فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر لوگ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن وسلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ کچھ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانونِ شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلتی ہیں گنگ ہو جائیں گی!

(۱/۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اہانت رسولؐ ـــــــ ایک سنگین جرم

دُنیا کی معلوماتی تاریخ میں ہمیشہ ہی انسان کی غالب اکثریت مذہب پر یقین رکھتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اسلام اور خدا کے سامنے خود سپردگی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے،'' فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا '' (الروم: ۳۰) یہ اور بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب ہدایت سے محرومی کی بنا پر جذبۂ بندگی کا غلط استعمال کرے اور اس کا سر خالق کے بجائے مخلوق کے سامنے خم ہونے لگے، لیکن بہر حال مذہب سے وابستگی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب اور اپنے مذہبی پیشوا سے وابستگی کا مسئلہ انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ جذباتی اور حساس مسئلہ ہوتا ہے، جاں نثاری وفداکاری اور قربانی کی جو مثالیں مذہب کی نسبت سے ملیں گی، شاید ہی کہیں اور مل پائے، اس راہ میں کتنے ہی لوگوں نے اآگ پر چلنا، شعلوں میں جلنا، سمندر میں غرقاب ہونا اور زندہ پیوندِ خاک کیا جانا تو قبول کیا ہے، لیکن اپنے فکر وعقیدہ سے انحراف کسی طور پر گوارا نہیں کیا، اس لئے ہر عہد میں عدل وانصاف کی راہ چلنے والوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلتے ہوئے دوسرے مذاہب کے متبعین کے جذبات کا پاس رکھنا ضروری ہے اور یہ تو درست ہے کہ آدمی کسی فکر اور عقیدہ پر سنجیدہ علمی تنقید کرے، لیکن کسی مذہب اور مذہبی پیشوا کے ساتھ تنقیص وتمسخر اور سب وشتم کرنا کوئی بھی مذہب اور قانون روا نہیں رکھ سکتا۔

اسلام دینِ فطرت ہے، جس نے انسانی جذبات کی تکریم کا قدم قدم پر پاس رکھا ہے، وہ اس پہلو سے بھی ایک مکمل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ دین ہے، گزشتہ انبیاء کی نسبت قرآن مجید کو'' مصدق '' قرار دیا گیا، (البقرۃ: ۸۹) یعنی یہ کتاب گزرے ہوئے پیغمبروں کی

تصدیق کرتی ہے،اور دنیا کی بدنصیب قوموں نے ان برگزیدہ ہستیوں کی پاک زندگیوں پر تہمت اور بدگمانیوں کا جو غبار رکھ دیا تھا، یہ کتاب انہیں صاف کرتی ہے، بائبل حضرت نوحؑ کے بارے میں کہتی ہے کہ شراب پی کر برہنہ ہوگئے، (تکوین: ٢، ٢١) حضرت لوطؑ کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ (نعوذ باللہ) انہوں نے خود اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کی، (پیدائش ٢٠: ٣٠) حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے یہودا کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی بہو سے بدکاری کی، (پیدائش ٣٨: ١٨) وہ حضرت داؤدؑ کو اپنے سپاہی کی منکوحہ سے ملوث قرار دیتی ہے، (٢۔ سموئیل ١١: ٢) حضرت سلیمان کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ مرتد و بت پرست ہوگئے تھے، حضرت یوسفؑ کو بدقماش ٹھہراتی ہے، حضرت مسیحؑ کو لعنتی گردانتی ہے، قرآن اور حامل قرآن نے حضراتِ انبیاء کی پاکیزہ زندگیوں پر چڑھائی گئی بدگمانی اور تہمت اندازی کی ان دبیز چادروں کو چاک کیا اوران کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اورانسانوں کے لئے اسوہ و نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اوران کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اورانسانوں کے لئے اسوہ و نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا، اسی لئے ہر مسلمان پر اپنے پیغمبر کی طرح ہر پیغمبر پر ایمان لانا اور ان کے احترام کو برقرار رکھنا واجب ہے، ایک مسلمان محمد عربی ﷺ پر کتنا بھی یقین رکھتا ہو اور شریعتِ اسلامی پر عمل کرنے میں کتنا ہی پابند نظر آتا ہو، اگر اس نے ایک بھی رسول کا انکار کیا یا ان کی ہتکِ شان کی، تو وہ مسلمان باقی نہیں رہ سکتا۔

پھر قرآن مجید نے ایک اُصولی بات کہی ہے جو ہر مسلمان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اسلام سے پہلے کے تمام مذہبی پیشواؤں کا احترام کریں اوران کے بارے میں محتاط لب و لہجہ اختیار کریں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، ہر قوم میں اپنا پیغمبر مبعوث کیا ہے (فاطر: ٢۴) اور ہر زبان میں اپنا صحیفۂ ہدایت نازل فرمایا، (ابراہیم: ۴) یہ عقیدہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مختلف اقوام جن مذہبی پیشواؤں پر ایمان رکھتی ہیں، عجب نہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اللہ کے رسول رہے ہوں اوران کی تعلیمات میں انسانی تحریف اور ملاوٹ نے ان کو توحید سے دور کردیا ہو، رام جی ہوں یا کرشن جی، بودھ مت ہوں یا کنفیوشس، مسلمان ان کے بارے میں بدگوئی نہیں کرسکتے، حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان

صرف پانچ سوستر سال کا فاصلہ ہے، اس کے باوجود بائبل (عہد جدید) میں کیا کچھ تحریف نہیں ہوئی، خود عیسائی علماء اور محققین کو اس کا اعتراف ہے، تو ان بزرگوں کا عہد تو اسلام سے بہت پہلے کا ہے، ان کی تعلیمات میں انحراف وتبدیلی کا پایا جانا بالکل عجیب نہیں!

یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے جو مقامِ نبوت پر فائز ہیں، یا جن کے بارے میں اس کا احتمال موجود ہے کہ وہ اپنے عہد کے پیغمبر رہے ہوں، قرآن نے تو معبودانِ باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا کہ اس سے انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ردِ عمل کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے، (الانعام: ۱۰۸) قرآن کا مطالعہ کیجئے اور احادیث پر نظر ڈالئے! عقیدۂ توحید کا اثبات اور شرک کی تردید قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات کا لب ولباب اور روح کا خلاصہ ہے، لیکن انبیاء ورسل کے احترام میں کہیں کوئی کمی نہیں اور مخالفین کی نہ کہیں دل آزاری ہے اور نہ جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی زبان اور بیان۔

اسلام جو رویہ دوسرے مذاہب کی بابت اختیار کرتا ہے، چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی اسی سلوک کو روا رکھا جائے، نظریاتی تنقید نے کبھی مسلمان علماء یا عوام کو مشتعل نہیں کیا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی اور علمی بلند نگاہی کے ساتھ ان کا سامنا کیا، اسلامی تھیالوجی جو ''علم کلام'' کے نام سے علومِ اسلامی کا ایک اہم شعبہ مانا جاتا ہے، کا موضوع ہی یہی ہے کہ اعتقادات کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا جائے اور اسلامی معتقدات پر کئے جانے والے شبہات کا جواب دیا جائے، خود ہندوستان میں اسلام کے خلاف ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کی سرخ دل آزادی اور دریدہ ذہنی سے جا ملتی تھی، جیسے پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ''ستیارتھ پرکاش''، لیکن مسلمانوں نے ایسی تحریروں پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اس کا دندان شکن اور مسکت علمی جواب دیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی مذہب اور اس مذہب کے متبعین کے لئے یہ بات گوارا نہیں ہوسکتی کہ اس کے بارے میں سب وشتم اور یاوہ گوئی کا طریقہ اختیار کیا جائے، بلکہ کوئی بھی معقول قانون ایسے طرزِ عمل کو برداشت نہیں کرسکتا، جس سے لاکھوں انسانوں کے جذبات مجروح اور احساسات زخمی ہوں، آج منشیات کی اسمگلنگ کی سزا قتل ہے، کسی ملک کے جھنڈے

کی توہین کی جائے تو یہ سخت قابل مواخذہ ہے، تو کیا مذہبی پیشواؤں کی توہین اس درجہ کا جرم نہیں؟ اسی لئے اسلام میں رسولوں اور پیغمبروں کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی سزا قتل ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے بھی اس سنگین جرم کی یہی سزا منقول ہے، (فتح القدیر: ۶۲/۶) حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سے بڑی بھی کوئی سزا ہوسکتی اور ایک مجرم کو ایک سے زیادہ دفعہ قتل کیا جانا ممکن ہوتا تو ایسا شخص اس کا بھی سزاوار تھا، کیوں کہ ایک انسان کے قتل کی سزا قتل ہے، حالاں کہ اس سے ایک خاندان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ایک ملک سے بغاوت کی سزا قتل ہے، حالاں کہ اس سے بھی ایک محدود گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو ایک ایسی شخصیت کی بے احترامی جس سے کروڑوں انسانوں کے احساسات مجروح ہوتے ہوں، اس کا مجرم یقیناً اس سے بڑی سرزنش کا مستحق ہے۔

فقہاء کے یہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، فقہ کے چاروں دبستان حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ اس بابت متفق ہیں، (دیکھئے: ردالمحتار: ۲۹۰/۳، المغنی: ۳۳/۹) اور علامہ ابن تیمیہؒ نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب ''سیف اللہ المسلول علی شاتم الرسول'' کے نام سے لکھی ہے، بلکہ بعض حنفی فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول کے ساتھ گستاخی کرنے والے شخص کی دُنیا کے احکام کے اعتبار سے توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی، چاہے آخرت میں اس کی توبہ قبول ہو جائے، علامہ عبدالرشید طاہر بخاریؒ ممتاز فقہاء میں ہیں، لکھتے ہیں:

> ''جس نے رسول ﷺ کو برا کہا، آپ ﷺ کی اہانت کی، آپ ﷺ کے دین، آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ ﷺ کے اوصاف کی نسبت سے بدگوئی کی، تو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہودی، عیسائی ہو یا مشرک، مسلم ملک کا مسلم باشندہ ہو یا دارالحرب کا، اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔''
>
> (خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۸۶/۴)

شاید یہ اس لئے کہ اگر اس معاملہ میں ایسی سختی کو روا نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ بدقماش اور بد دہن قسم کے لوگوں کو موقع مل جائے کہ وہ بدگوئی کریں اور پھر سزا سے بچنے کے لئے اپنے تائب ہونے کا اظہار کریں اور اس طرح حضرات انبیاء کرام، جو انسانیت کے لئے

چراغِ راہ اور خضرِ طریق تھے، کی حیاتِ طیبہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

اس وقت ذرائع ابلاغ میں پاکستانی عدالت کا وہ فیصلہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، جس میں ''ایوب مسیح'' نامی ایک عیسائی کو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہانت کے جرم میں پھانسی کی سزا تجویز کی گئی، اس پر ۶۷/ سالہ کیتھولک بشپ جان جوزف نے عدالت میں احتجاجاً خودکشی کر لی اور وصیت کی کہ جب تک یہ قانون منسوخ نہ ہو، اس کی لاش اٹھائی نہ جائے، مغربی ممالک کو چاہئے تھا کہ وہ ایوب مسیح کی اس ناشائستہ حرکت کی مذمت کرتے اور عیسائیوں کو تلقین کرتے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا پاس ولحاظ کریں اور بشپ کی اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی خودکشی کو ظلم اور ایک غیر قانونی کام میں تعاون تصور کرتے، مگر اس کے بجائے وہ ان مجرموں سے ہمدردی کا رویہ اختیار کر رہے ہیں اور پاکستان کو تلقین کر رہے ہیں کہ اس نامنصفانہ قانون کو منسوخ کرے۔

یہ بھی یک طرفہ تماشہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ میں عیسائیت اور حضرت مسیح کی اہانت قابل سرزنش جرم ہو تو یہ غیر منصفانہ نہیں، مصر و الجزائر میں مغرب نواز حکومتیں کسی معقول سبب کے بغیر سیکڑوں علماء کو آئے دن پھانسی دیتی رہیں، تو مغرب کے کانوں پر جوں نہ رینگے، بوسنیا میں انسانوں کو اتنی بے دردی سے ذبح کیا جائے کہ لگ سانپ اور درندہ جانوروں کے ساتھ بھی شاید ایسا رویہ نہیں برتتے ہوں، تو اس ''عیسائی دہشت گردی'' پر زبانی جمع خرچ سے آگے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، اسرائیل میں جبراً عربوں سے ان کا مکان خالی کرالیا جائے اور عین مسجد میں مسلمانوں کا قتل عام ہو جائے تو مغربی اقوام کو خوابِ خرگوش سے فرصت نہ ہو، لیکن کروڑوں انسان کے جذبات کو مجروح کرنے والے ایک مجرم کے لئے انسانیت اور تہذیب کے یہ نام نہاد علمبردار ایک زباں ہو کر کھڑے ہو جائیں، افسوس کہ مغرب نے اپنے جسم سے حیا کا لباس تو اُتار ہی پھینکا تھا، انصاف و غیر جانبداری کا جو مصنوعی غازہ اپنے چہرہ پر مل رکھا ہے، یہ بھی معمولی واقعات ہی سے اُتر جاتا ہے اور اندر کا مکروہ چہرہ دیکھنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آتی!

(۲۲/ مئی ۱۹۹۸ء)

اوھام پرستی اور اسلام

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''توحید'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے، خدا کا کوئی کنبہ اور خاندان نہیں اور نہ اس کے لئے اولاد اور اعزہ و اقارب ہیں اور خدا اپنی صفات اور اختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا و بے مثال ہے، حیات و موت کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، رزق میں وسعت اور تنگی بڑھاتا ہے اور رزق سے محروم کرتا ہے، وہی نفع پہنچاتا ہے اور وہی نقصان سے دوچار کرتا ہے؛ کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست اسی کے حکم سے وابستہ ہے۔ توحید کا یہ تصور در در سر جھکانے سے انسان کو بچاتا ہے اور بہت سی غلامیوں سے نجات عطا کرتا ہے، انہی میں ایک توہمات کی غلامی ہے۔

اوہام پرستی بھی ایک طرح کی غلامی ہے، کہ آدمی اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والی چیزوں سے بھی ڈرنے اور خوف کھانے لگے اور اس سے اپنے نفع و نقصان کو وابستہ کر لے، اگر سامنے سے کوئی جانور نکل جائے تو آدمی سمجھے کہ یہ سفر ناکام ہوگا، گھر پر کوئی پرندہ بیٹھ جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ سمجھنے لگے، کسی خاص پتھر کی انگوٹھی سے کامیابی اور نفع کی امید رکھے، کسی مہینہ، دن اور گھڑی کو نامبارک، منحوس اور ''اشبھ'' تصور کرنے لگے: یہ سب توہمات کی غلامی ہے، جو شخص عقیدۂ توحید سے محروم ہو اور خدا پر اس کا یقین کامل نہ ہو، مشکل ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے، یہی وجہ ہے ایسے ترقی یافتہ ممالک جہاں صد فیصد تعلیم یافتہ لوگ پائے جاتے ہیں، وہاں بھی لوگ بعض اعداد کو منحوس سمجھتے ہیں، ہوٹلوں میں اس نمبر کے روم نہیں رکھے جاتے۔

جو شخص توحید پر جتنا پختہ یقین رکھتا ہو اور اللہ پر جس کا جتنا زیادہ ایمان ہو، وہ اسی قدر اوہام پرستی کی اس مصیبت سے آزاد اور توہمات کا اسیر بننے سے محفوظ رہے گا، اسلام کی آمد سے پہلے عربوں میں اس طرح کے توہمات پائے جاتے تھے، لوگ سفر کے لئے نکلتے، پرندے کو اڑایا جاتا، اگر وہ دائیں جانب اڑتا، تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے اور اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے، اسی طرح اُلو کو منحوس پرندہ خیال کرتے، کسی کے گھر پر بیٹھ جاتا تو سمجھتے کہ یہ گھر اجڑ جائے گا، صفر کے مہینہ کو نامبارک سمجھتے، سمجھتے کہ اس ماہ میں جو کاروبار ہوگا نقصان سے دوچار ہوگا، جو سفر ہوگا وہ نامراد ہوگا، جو شادی ہوگی وہ ناکام ہوگی، رسول اللہ ﷺ نے ان تصورات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ: ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ (بخاری: باب الجذام)

دوسرے کو بیماری لگنے، پرندہ سے بدفالی، الو اور ماہِ صفر کو منحوس سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

عربوں میں اور ایک خیال یہ تھا کہ صحراء میں کچھ شیاطین ہوتے ہیں، جو رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور راہ گیروں کو راستہ سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں، عرب ان کو "غول" کہا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس تصور کی بھی نفی فرمائی (فتح الباری: ۱/۱۶۸) عرب شوال کے مہینہ کو بھی نامبارک اور شادی بیاہ کے لئے ناموزوں تصور کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے شوال میں نکاح فرمایا اور شوال ہی میں رخصتی بھی ہوئی، چنانچہ حضرت عائشہؓ اس خام خیالی کی تردید کرتے ہوئے فرماتی تھیں کہ میرے نکاح سے زیادہ بابرکت نکاح کون سا ہوسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر جس قدر قوی ایمان ہوگا، اوہام پرستی سے انسان اسی قدر دور رہے گا، اسلام نے توحید کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں ایسا راسخ کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کے تصور کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے، حضرت زنیرہؓ ایک صحابیہ ہیں، ایمان لائیں، لوگوں نے اتنا ظلم کیا کہ آنکھ کی بینائی جاتی رہی، لوگ کہنے لگے کہ دیویوں، دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے اور ان کا انکار کرنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئی ہے، ہمارے

زمانہ میں عورتیں تو کیا مرد بھی اور جاہل وان پڑھ تو کیا پڑھے لکھے بھی ایسے موقعوں پر گرفتارِ اوھام ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت زنیرہؓ کی فکر میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا کہ ان کی صرف بصارت اللہ نے لی تھی، وہ ایمان اور ایمانی بصیرت سے محروم نہیں ہوئی تھیں، حضرت زنیرہؓ کہتی ہیں کہ یہ سب اللہ کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہے، رسول اللہ ﷺ ان کی استقامت اور ثابت قدمی سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی، چنانچہ پھر ان کی بصارت لوٹ آئی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر کی معیشت کا مدار دریائے نیل پر تھا، یہاں معمول تھا کہ یہ دریا جب خشک ہو جاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی بلاخیز موجیں اٹھتیں اور اسے موت کی نیند سلانے کے بعد جاری ہو جاتیں، جب مصر کے خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنر مصر حضرت عمر ابن عاصؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اولاً تو انکار کیا، پھر لوگوں کے اصرار پر مشورہ کے لئے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کو خط لکھا، حضرت عمرؓ نے اپنے جواب کے ساتھ ایک اور تحریر دریائے نیل کے نام لکھا اور ہدایت دی کہ اس تحریر کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، حضرت عمرؓ نے اپنی اس تحریر میں دریا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ تو جاری ہو جائے اور اگر اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں، حسب ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی اور دیائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو ہفتہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہو گیا (البدایہ والنہایہ: ۱۰۰/۷) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں پیش آیا، جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے کہ یہاں کے لوگ کافر تھے، یہاں ہر ماہ شیطان وارد ہوتا، اس کے لئے سمندر کے کنارے ایک بت خانہ بنا دیا تھا، جو "بدخانہ" کہلاتا تھا، جو دن شیطان کی آمد کا ہوتا، لوگ اس دن ایک کنواری لڑکی کو سنوار کر اس بدخانہ میں بٹھا لیتے،

رات میں وہیں چھوڑ دیتے، جب صبح کو آتے تو اسے اس حال میں پاتے کہ وہ مردہ ہوتی اور کنواری نہ ہوتی، اتفاق سے یہاں ایک ایک مغربی تاجر ابوالبرکات بربری جو حافظِ قرآن تھے، آئے ہوئے تھے، وہ ایک بوڑھی خاتون کے مہمان تھے، ایک دن جب اپنے میزبان کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ خلافِ معمول وہ بوڑھی خاتون بہت سی عورتوں کے ساتھ مصروفِ گریہ وبکا ہے، ایک ترجمان کے واسطہ سے صورتِ حال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ شیطان سے بچاؤ کے لیے آج اس کی اکلوتی بیٹی کے نام قرعۂ فال نکلا ہے۔

شیخ ابوالبرکات کو داڑھی نہ تھی، انہوں نے پیشکش کی کہ آج اس لڑکی کی جگہ وہ جائیں گے، چنانچہ وہ بدخانہ میں بیٹھ گئے اور قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی طرح پوری رات گذری، جب معمول کے مطابق لوگ صبح میں تحقیق حال کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ وہ زندہ وسلامت ہیں اور تلاوت میں مصروف ہیں، یہ خبر شدہ شدہ پورے علاقہ میں پھیل گئی اور علاقے کے راجہ تک اطلاع پہنچی، ابن بطوطہ نے اس کا نام ''وشنوازہ'' لکھا ہے، عجب نہیں کہ یہ ''وشنو راجہ'' کی بدلی ہوئی صورت ہو، شیخ نے راجہ پر بھی اسلام پیش کیا، اس نے کہا کہ آئندہ ماہ تک میرے پاس رہو، اگر آئندہ مہینہ میں بھی تم یہی عمل کر کے دکھاؤ اور ہم لوگوں کو اس شیطان کی ابتلاء سے بچا سکو تب ہم ایمان لے آئیں گے، اگلے ماہ بھی یہی واقعہ پیش آیا، چنانچہ راجہ مسلمان ہوگیا اور راجہ کے ساتھ رعایا کے اکثر لوگ بھی مسلمان ہوگئے۔ (رحلۃ ابن بطوطہ: ار۵۸۹-۵۹۰)

اگر ایمان قوی ہو اور اللہ سے نفع ونقصان کا سچا یقین ہو تو ایک جاہل اور ان پڑھ شخص بھی ایسے اوہام وخرافات میں مبتلا نہیں ہوسکتا، تیمور لنگ کوئی عالم وفاضل حکمراں نہیں تھا، لیکن جب اس نے دریائے جمنا کو عبور کرنا چاہا تو جیوتشیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ منحوس گھڑی ہے، تیمور نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہم اربابِ تنزیہ وتوحید ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، یہ تو مشرکین اور تثلیث پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے اور اگر ایمان میں ناپختگی اور یقین میں کمزوری ہو تو اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی ایسی چیزوں کا شکار ہوسکتے ہیں۔

اس ملک میں رہتے ہوئے جہاں ہم نے برادرانِ وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسوم وروایات میں ہندو معاشرت کا اثر قبول کیا، وہیں فکر وعقیدہ کے باب میں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، ان ہی میں سے ایک اوہام پرستی کا مزاج و مذاق ہے، آج مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ بلی راستہ کاٹ دے تو سفر ملتوی کردینا چاہئے، الو کا بیٹھنا نحس کی علامت ہے، اگر کسی بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کو منحوس تصور کیا جاتا ہے، گھر کی تعمیر شروع ہو تو ناریل پھوڑے جاتے ہیں، گاڑی خرید کی جائے تو چند لیموں لٹکائے جاتے ہیں اور اب ایک نئی بات گھر کی تعمیر میں ''واستو'' کی شروع ہوئی ہے، پنڈت بتاتا ہے کہ گھر کو کس ڈیزائن کا ہونا چاہئے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی میں بے برکتی ہوگی اور نقصان اٹھانا پڑے گا، حالانکہ شرعاً ایک مسلمان کے لئے صرف یہ رعایت ضروری ہے کہ بیت الخلا کی نشست ایسی ہو کہ قضاءِ حاجت کرتے ہوئے چہرہ یا پشت قبلہ کی سمت میں نہ پڑے اور بس، مکان کے سلسلہ میں اس کے علاوہ انجینیر سے مشورہ کرنا چاہئے کہ مکان کس طرح کا ہو، کہ ہوا اور روشنی پوری طرح بہم پہنچے، لیکن اس کا مشورہ بھی پنڈتوں سے کیا جاتا ہے، جو محض چند پیسوں کے لئے لوگوں کو اوہام میں گرفتار رکھنا چاہتا ہے، یہ تمام باتیں محض ایمان کی کمزوری اور ضعفِ عقیدہ کا نتیجہ ہیں، حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقد نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑوں کے سلسلہ میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں، گویا جس غلامی سے اسلام نے اسے آزاد کیا تھا، خود ہی اپنے آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ آپ ﷺ نے کھلے لفظوں میں ''صفر'' کے منحوس ہونے کی تردید فرمائی، یہ تردید نہایت ہی صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہے، اس کے باوجود ''صفر'' کی ۱۳رتاریخ اور آخری چہار شنبہ کو منحوس دن تصور کیا جاتا ہے، کچھ لوگ چھلے فروخت کرنے اور اپنے روزگار کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے باور کراتے ہیں کہ اس دن ڈھیر ساری بلائیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ان کا علاج کر سکتے ہیں، حالانکہ اسلام کی نگاہ

میں کوئی وقت منحوس نہیں، آپ ﷺ نے بعض مہینوں، راتوں اور گھڑیوں کو مبارک ضرور قرار دیا، لیکن کوئی وقت اور گھڑی نامبارک نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نحس ہوتا تو تین چیزوں میں ہوتا: عورت، گھر اور سواری، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز میں نحس ہے ہی نہیں، یہ مشرکانہ تصور ہے کہ انسان اللہ کے بجائے ایسی چیزوں سے نفع و نقصان کو متعلق سمجھے، اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کچھ اور ہو سکتی ہے کہ کوئی قوم علم رکھنے کے باوجود انجانوں جیسا کام کرے اور خدا نے جس کی پیشانی چوکھٹوں کے داغ مذلت سے آزاد کیا ہو وہ خود اپنی جبینِ شرافت کو داغ دار اور رسوا وخوار کرے؟؟

وندے ماترم

اپنے وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے، انسان جس فضا میں بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے، وہاں کے ایک ایک ذرہ سے انس اور پیار ہوتا ہے، صحابہؓ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچے تو اہل مدینہ نے دل ونگاہ فرش راہ کردیئے، لیکن اس کے باوجود مہاجرین کی بے قراری کم نہ ہوتی تھی، وہ مکہ کے پہاڑوں، ریگزاروں اور گھاس کو یاد کرکر کے تڑپتے تھے، حضور ﷺ ان کو تسلی دیتے تھے اور دعاء بھی فرماتے تھے کہ مدینہ کی سرزمین ان کو محبوب ہوجائے، خود آپ ﷺ نے جب مکہ سے رخت سفر باندھا تو شہر سے باہر نکل کر مکہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت درد سے فرمایا کہ مجھے تمہارا فراق گوارا نہیں تھا، لیکن اہل مکہ کی بدسلوکی نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے، پھر جب مدینہ کو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اپنا وطن بنایا، تو مدینہ ایسا محبوب ہوا کہ آپ ﷺ کو اس کے خشک پہاڑ سے بھی پیار تھا، جب کبھی سفر سے تشریف لاتے اور اُحد پہاڑ پر نظر پڑتی، تو ایک خاص مسرت ہوتی، سواری کی رفتار بڑھادیتے اور فرماتے کہ یہ پہاڑ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

یہ محبت اگر جائز اخلاق اور شرعی حدود میں ہو، تو اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، بشرطیکہ یہ محبت دل وانصاف اور حق وسچائی کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے اور عصبیت جاہلیہ کی حد میں داخل نہ ہوجائے، اسلامی اور انسانی اخوت اس سے مجروح نہ ہو، اسی لئے مسلمان جس ملک میں گئے، وہیں کے ہو رہے، انہوں نے ٹوٹ کر اس ملک سے محبت کی اور ملک کے باشندوں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر رہے، مظلوموں کی دستگیری کی، ستم رسیدوں کے پشت پناہ ہوئے، دبے کچلے لوگوں کو اٹھایا، ظالموں سے پنجہ آزمائی کی اور

اخلاقی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ملک کی خدمت کی۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے، تو ملک چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم تھا، ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو غلام بنا رکھا تھا، ملک کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کے سایہ کو بھی منحوس تصور کیا جاتا تھا اور جن کو حیوان سے بھی کم تر درجہ حاصل تھا، عورتیں سامان واملاک کے درجہ میں تھیں اور اس ملک میں دور دور تک انسانی وحدت واخوت کا کوئی تصور تک نہیں تھا، مسلمانوں نے اس ملک کو انسانی وحدت کا عقیدہ دیا، اقسام وتفریق کی دیواریں منہدم کیں، پست کو بالا کیا اور ہر طبقہ کو عزت واحترام عطا کیا، سیاسی اعتبار سے متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے ملک کو ایسی ترقی دی کہ مشرق و جنوب کو اس پر رشک آتا تھا اور اس کو ''سونے کی چڑیا'' خیال کیا جاتا تھا، ملک کے طول و عرض کو ایسے مضبوط قلعے، خوبصورت مقبرے، پر شکوہ مسجدیں، وسیع اور حسین باغات، کشادہ سڑکیں اور یادگار تاریخی عمارتیں دیں کہ وہی آج ہندوستان کی پہچان ہیں اور انہیں سے ملک کی تہذیبی اور تمدنی شناخت ہے۔

پھر جب ہندوستان میں انگریزوں نے قدم رکھا اور بتدریج پورے ملک کو غلام بنا لیا، تو پہلے جو لوگ ان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے، وہ مسلمان ہی تھے، آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں نے جس طرح خون ولہو نثار کئے اور ملک کے تمام طبقوں سے بڑھ کر محبت ووفاداری کا حق ادا کیا، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار مہر نیم روز کے انکار سے کم نہیں، آزادی کے بعد بھی مسلمانوں نے برادرانِ وطن کے دوش بدوش ملک کی ترقی میں حصہ لیا اور ملک کی حفاظت ومدافعت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، یہ مسلمانوں کی حب الوطنی ہی ہے کہ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کے جرم میں جو لوگ پکڑے جاتے ہیں، ان میں مسلمانوں کا تناسب شاید ایک فی صد بھی نہ ہو۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کی محبت ایمان اور عقیدۂ توحید کے دائرہ ہی میں ہوگی، ملک کی محبت ہو یا قوم کی، ماں باپ کی محبت ہو یا بال بچوں کی، ہر محبت حکم خداوندی کی پابند ہے کسی مسلمان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی انسان سے خدا اور رسول سے

بڑھ کر محبت کرے، اسی طرح اس کے لئے اس کی بھی گنجائش نہیں کہ وہ کسی جگہ اور مقام سے خواہ یہ اس کا گھر ہی کیوں نہ ہو، حرمین شریفین سے زیادہ محبت رکھے، کسی مسلمان کو اس کا پابند کرنا کہ وہ روئے زمین کے کسی خطہ کو ان مقاماتِ مقدسہ سے زیادہ مقدس اور قابل احترام سمجھے، اس سے ایمان وعقیدہ کی آزادی کو سلب کرنا ہے اور ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے حاملین کا یہ حق بھی ہمیں تسلیم ہے کہ وہ اپنے مقدس مذہبی مقامات سے محبت واحترام کا خصوصی تعلق رکھیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ محبت اسی حد میں ہو جس کی اسلام اجازت دیتا ہے، اسلام کا سب سے بنیادی رکن عقیدۂ توحید ہے، توحید اس حقیقت کا اقرار واعتراف ہے کہ پرستش کے لائق صرف خدا ہی کی ذات ہے، خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں اور انسان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں، نہ زمین و پہاڑ کا، نہ درخت اور دریا کا، نہ سورج اور چاند کا اور نہ کسی اور مخلوق کا، اس لئے وطن سے ایسی محبت کو اسلام روا نہیں رکھتا جو بندگی اور پرستش تک جا پہنچے اور جس میں محبوب کو معبوب کا درجہ دیا جائے۔

اسی پس منظر میں اس نظم کو دیکھنا چاہئے جو ''وندے ماترم'' کے نام سے معروف ہے، یہ نظم چند چٹرجی کا ترانہ ہے، جو انگریزوں کی خوشامد میں کہا گیا ہے، اسی لئے ملک کے حقیقی بہی خواہ رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر لوہیا وغیرہ نے بھی اس نزاعی نظم کو ناپسند کیا ہے اور نظم کے بارے میں مسلمانوں کے اختلاف کے معقول اور مبنی بر حقیقت ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس نظم کا آغاز ہی اس مصرعہ سے ہوتا ہے۔

میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں!

پھر آگے یہ مصرعہ آتا ہے:

تو ہی مرا علم ہے، تو ہی مرا دھرم ہے

نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

میں غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں
غلام کے غلام کا غلام ہوں

اچھے پانی، اچھے پھلوں والی ماں! میں تیرا بندہ ہوں

اس نظم کے ایک مصرع میں ہندوستان کو دُرگا ماتا کا درجہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

تو ہی ہے درگا، دس مسلح ہاتھوں والی

اس نظم کے ایک ایک مصرعہ سے واضح ہے کہ شاعر مادرِ وطن کو محبوب سے آگے گزر کر ''معبود'' کا درجہ دیتا ہے، ظاہر ہے کسی مسلمان سے اس بات کا مطالبہ کرنا کہ وہ اس نقطۂ نظر کو قبول کرے اور وہ اپنے عقیدہ و ضمیر کے آواز کے برخلاف مشرکانہ اشعار کو پڑھے، مذہبی تشدد کے سوا اور کیا ہے؟ یہ تو اس کا اعتقادی پہلو ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نظم بنیادی طور پر بنگالی ناول '' آنند مٹھ'' کا حصہ ہے، جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا گیا ہے، نفرت کے شعلے بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے اور انگریزوں کی آمد کا خیر مقدم کیا گیا ہے، کیا کوئی محب وطن ہندوستانی ایسے اشعار کو پسندیدگی اور تحسین کی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟

ملک کے مختلف صوبوں میں جہاں بھاجپا برسرِاقتدار ہے '' وندے ماترم'' کو اسکولوں میں لانے کی سعی کی جارہی ہے اور عجب نہیں کہ اب کوشش کی جائے کہ پورا ملک اس ترانہ سے گونج اٹھے، لیکن مسلمان کے لئے نہ ان کا مذہب ان اشعار کے پڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ان کی حب الوطنی اور جمہوریت پسندی ہی ان کے لئے اس کو روا رکھتی ہے!

(۲۴رمئی ۱۹۹۸ء)

اختلاف میں اعتدال

اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمان ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں، اشتراکی نظام کی تباہی کے بعد پوری دنیا نے اسلام کے خلاف کمر کس لی ہے، اور اس مقصد کے لئے مشرق و مغرب کے روایتی حریف و رقیب بھی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا چکے ہیں، خود ہمارے ملک میں جن لوگوں کو دریا کے دو کنارے کہا جاتا تھا انہوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے فاصلے ختم کر لیئے ہیں، ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں، ایک اتحاد و اتفاق، دوسرے حکمت و تدبیر۔

اتحاد و اتفاق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت میں کوئی اختلاف ہی باقی نہ رہے، اختلاف رائے پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اور اس کے باقی رہنے ہی میں خیر ہے، لیکن اختلافِ فکر نہ اتحادِ عمل میں مانع ہے، نہ باہمی توقیر و احترام میں، اگر ہم نے اس بات کو نہیں سمجھا تو یہ ایسی بدبختی کی بات ہوگی کہ شاید اس کی تلافی ممکن نہ ہو، اور تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے، — مسلمانوں کے باہمی اختلاف کچھ تو عقائد میں ہے، اور زیادہ تر عملی احکام میں، عقائد میں بعض اختلاف یقیناً گمراہی کے قبیل سے ہے، لیکن جو لوگ اہلِ سنت والجماعت کی راہ سے منحرف ہوں ان کو بھی کافر کہنے میں سلف صالحین نے بہت احتیاط کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو باوجود ان کے فسادِ فکر و عمل کے کافر قرار دینے سے اجتناب فرمایا، معتزلہ سے دسیوں اعتقادی مسائل میں اختلاف کے باوجود اہلِ علم نے ان کی تکفیر سے گریز کیا، اور قدریہ و جبریہ وغیرہ کا شمار تقدیر کے مسئلہ میں اہلِ سنت والجماعت سے سخت اختلاف کے باوجود بھی مسلمان فرقوں میں کیا گیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف کے اختلاف رائے میں کس قدر اعتدال تھا!

خود اہلِ سنت والجماعت کے درمیان بھی بعض اعتقادی مسائل میں اختلاف رہا ہے، اور یہ عہدِ صحابہؓ سے ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ شب معراج میں رسول اللہ ﷺ کے باری تعالیٰ کو دیکھنے کے قائل تھے، حضرت عائشہؓ کو اس سے انکار تھا، بعض صحابہؓ اس کے قائل تھے کہ مردہ پر اس کے اہل وعیال کے رونے سے عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہؓ اس کی تردید کرتی تھیں، بعض صحابہؓ کی رائے تھی کہ مردے سنتے ہیں، اور جمہور اس کے قائل نہیں تھے، یہ اختلاف صحابہؓ کے بعد بھی صدیوں اہلِ علم بلکہ عوام کے درمیان بھی زیرِ بحث رہا۔

بعد کے ادوار میں جب اسلام کے اعتقادی تصورات علم کلام کے نام سے مرتب کئے گئے تو اصولی مسائل میں اتحاد کے باوجود ان عقائد کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتفہیم میں خاصا اختلاف پیدا ہوا، اور اشعری، ماتریدی اور حنبلی دبستان فکر ابھرے، لیکن اس اختلاف نے کبھی جھگڑے اور نزاع کی صورت اختیار نہیں کی، لوگ ایک دوسرے سے علمی استفادہ کرتے، ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے، ان کے علم وفضل، ورع اور تقویٰ کا برملا اعتراف کرتے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس طرح کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلف اس بات پر متفق تھے کہ اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ **اتفقوا على عدم التكفير بذالك** (مجموع الفتاویٰ: ۱۲/۴۹۵)

دوسری قسم کا اختلاف وہ ہے جو فقہی مسائل میں پیدا ہوا ہے، یہ اختلاف عہدِ صحابہؓ سے ہے، اور جو اختلاف صحابہؓ کے دور میں رہا ہے اس کے باقی رہنے میں خیر ہی ہے نہ کہ شر، غور کیا جائے تو اس اختلاف کو باقی رکھنا خود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشاء ہے، اور یہ بات ادنیٰ غور وتامل سے معلوم ہوسکتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے وضوء میں سر کا مسح کرنے کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے ''**وامسحوا برؤسكم**'' یہاں لفظ ''ب'' استعمال کیا گیا ہے، ''ب'' کے معنی عربی زبان میں بعض یعنی کچھ حصہ کے بھی ہوتے ہیں، اور ''ب'' زائد بھی ہوتی ہے، پہلی صورت میں معنی ہوگا سر کے بعض حصہ کا مسح کرلو، اور دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ پورے سر کا مسح کرو، چنانچہ بعض فقہاء پورے سر کے مسح کو ضروری قرار دیئے ہیں، اور دوسری رائے کے مطابق سر کے کچھ حصہ کا مسح کافی ہوگا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم

میں ''ب'' کے یہ دونوں معنی پہلے سے موجود ہیں، اگر اللہ چاہتے تو بعض کا لفظ استعمال فرماتے، اور متعین ہو جاتا کہ پورے سر کا مسح ضروری نہیں، یا ''کل'' کا لفظ ارشاد فرماتے اور یہ بات پوری طرح بے غبار ہو جاتی کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے، لیکن خدائے علیم وخبیر نے اس صراحت کے بجائے اپنی کتاب میں ایک ایسا لفظ ذکر فرمایا جس میں دو معنوں کا احتمال ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ایسے مسائل میں اختلاف رائے کا باقی رہنا خود منشاء ربانی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں عورت کی عدت کے لئے تین ''قرء'' گذارنے کا حکم دیا گیا ہے، ''قرء'' کے معنی حیض کے بھی ہیں اور زمانہ پاکی کے بھی، اسی لئے بعض فقہاء نے تین حیض مدت قرار دی ہے اور بعض نے تین پاکی، ظاہر ہے کہ ''قرء'' کے دونوں معانی اللہ تعالیٰ کے علم محکم میں پہلے سے تھے، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو تو قرآن میں بجائے ''قرء'' کے صریحاً حیض یا طہر کا لفظ استعمال کیا جاتا، یہی صورتِ حال احادیثِ نبوی میں بھی ہے، مثلاً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حالت اغلاق کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اغلاق کے معنی جنون و پاگل پن کے بھی ہیں اور اکراہ و مجبوری کے بھی، چنانچہ اپنے اپنے فہم کے مطابق بعضوں نے ایک معنی کو ترجیح دی ہے اور بعضوں نے دوسرے معنی کو، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ افصح العرب یعنی عرب کے سب سے زیادہ فصیح شخص تھے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ایسی واضح تعبیر اختیار فرماتے کہ ایک ہی معنی متعین ہو جاتا، دوسرے معنی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ایک ہی واقعہ میں مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے مختلف عمل ثابت ہے، جیسے نماز ہی کو لے لیجئے کہ تکبیر تحریمہ میں کبھی آپ ﷺ نے کانوں تک ہاتھ اٹھایا، کبھی مونڈھوں تک، اور کبھی ان دونوں کے درمیان، دونوں ہاتھ کبھی آپ ﷺ نے ابتداء نماز ہی میں اٹھائے ہیں، کبھی رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی، کبھی دو سجدوں کے درمیان اور دوسرے مواقع پر بھی، ہاتھ آپ ﷺ نے کبھی ناف کے نیچے باندھے ہیں اور کبھی ناف سے اوپر، آمین کبھی آہستہ کہی ہے اور کبھی زور سے، قعدہ میں کبھی پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے

ہیں اور کبھی کولھوں پر، عیدین میں کبھی چھ تکبیرات زوائد کہی ہیں کبھی اس سے زیادہ، یہ خدا نخواستہ تناقض اور تضاد نہیں، بلکہ اس کا مقصد توسع اور فراخی ہے۔

یہ اختلافِ رائے چنداں بُرا نہیں، اسی لئے علامہ ابنِ قدامہ نے اپنی شہرہ آفاق تالیف ''المغنی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اتفاق حجت قاطعہ ہے، اور اختلاف رحمت واسعہ، **اتفاقهم حجة قاطعة اختلافهم رحمه واسعة**۔ حضرت ابوبکرؓ کے پوتے مشہور فقیہ قاسم بن محمد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے اختلاف سے فائدہ پہنچایا ہے کہ انسان ان میں سے کسی کی رائے پر عمل کر لے تو اسے خیال ہوگا کہ اس میں گنجائش ہے اور اس سے بہتر شخص نے اس پر عمل کیا ہے (جامع بیان العلم: لابن عبداللہ، ۲/۸۰) طلحہ بن مصرفؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کے سامنے فقہاء کے اختلاف کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے اسے اختلاف کا نام نہ دو بلکہ اسے فراخی اور گنجائش کہو، **لا تقولوا الاختلاف و لكن قولوا السعة** (حلیۃ العلماء: ۵/۱۱۹) علامہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے کہ ایک صاحب نے فقہاء کے اختلاف کے بابت ایک کتاب تالیف کی، تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس کو ''کتابِ اختلاف'' کا نام نہ دو، بلکہ اسے وسعت و فراخی کی کتاب کہو۔ **لاتسمه كتاب الاختلاف، ولكن سمه كتاب السعة** (المجموع الفتاوی: ۳۰/۷۹)

یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے درمیان یہ اختلاف کبھی باہمی توقیر و احترام، اور ان کے مرتبہ و مقام کے اقرار و اعتراف میں مانع نہ ہوتا تھا، امام اوزاعی شام کے مشہور فقیہ ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں انہیں بعض غلط فہمیاں تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں امام صاحب کے شاگرد امام عبداللہ بن مبارکؒ سے انہوں نے کچھ دریافت کیا، ابن مبارک نے حکمت سے کام لیتے ہوئے خاموشی اختیار کی، اور اگلے روز امام صاحب سے سنے ہوئے کچھ مسائل کو تحریر کر کے اس پر شیخ ثابت بن نعمان جو امام صاحبؒ کا اصل نام تھا اور جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں تھے تحریر فرما کر امام اوزاعیؒ کو پیش کی، امام اوزاعی پڑھ کر بہت متأثر ہوئے، اور ابن مبارک سے ان مضامین کی بہت تعریف کی، ابن مبارکؒ نے بتایا کہ

یہی اصل میں امام ابوحنیفہؒ ہیں، پھر جب حج کے موقع سے امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعی دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی، اور امام صاحبؒ سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تو امام اوزاعیؒ نے برملا اعتراف فرمایا کہ مجھے اس شخص پر ان کی کثرتِ علم اور دفورِ عقل کی وجہ سے رشک آیا، میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوں، میں ان کے بارے میں نہایت واضح غلط فہمی میں مبتلا تھا، مجھے ان کے بارے میں جو کچھ بات پہنچی ہے، یہ تو اس کے بالکل برخلاف ہیں، اور ابن مبارک کو ہدایت فرمائی کہ ان کا ساتھ نہ چھوڑو۔ (مناقب ابی حنیفہ للکردری، ۱/۴۵)

اس سلسلہ میں امام مالک اور امام لیث کی باہمی مراسلت اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کی رعایت کے بارے میں خاص کر اس دور کے اہلِ علم کے لئے پڑھنے کی چیز ہے، جس سے یہ غور و فکر کا ایک نیا منہج سامنے آتا ہے، امام شافعی کے ایک شاگرد یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی ہیں، ان کا ایک بار اپنے استاذ امام شافعیؒ سے ایک مسئلہ میں بھی مباحثہ ہو گیا اور دونوں کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکے، پھر جب امام شافعی کی ان سے ملاقات ہوئی تو امام صاحبؒ نے ہاتھ تھاما، اور فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ گو ایک مسئلہ میں بھی ہمارا اتفاق نہ ہو لیکن پھر بھی ہم بھائی بھائی بنکر رہیں الا یستقیم ان نکون اخوانا و ان لم نتفق فی مسئلة (سیر اعلام النبلاء ۱۶/۱۰۰) ___ یہ تھا ہمارے سلف صالحین کا طرز اختلاف!

یوں تو صحابہؓ اور بعد کے ادوار میں سینکڑوں فقہاء مقام اجتہاد پر فائز تھے، لیکن ان میں سے ائمہ اربعہ کو ایسے شاگرد ملے کہ انہوں نے اپنے تمام اساتذہ کی آراء کو جمع کر دیا، ان ائمہ اربعہ کی فقہ، کتاب وسنت کا نچوڑ اور صحابہؓ کے فتاویٰ کا خلاصہ ہے، اس نے قرآن و حدیث کے دائرہ میں آنے والے تمام مفاہیم اور رسول اللہ ﷺ کی تمام سنتوں کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ جمع کر لیا ہے، چنانچہ کم سے کم گیارہ سو سال سے امت ان مکاتب فقہ پر متفق ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق یہ امت کبھی غلط بات پر اکٹھا نہیں ہو سکتی، اور ان کو دین کا شارح مان کر ان کی تشریحات کو قبول کیا گیا ہے، نہ یہ کہ ان کو شارع کا درجہ دیا گیا ہے، چونکہ یہ دور فتنہ اور خواہش نفس کی اتباع کا ہے اس لئے اہلِ علم نے ان میں سے کسی ایک فقیہ کی تشریحات کو مشعلِ راہ بنانے کا حکم ضرور دیا ہے، لیکن کبھی

کسی نے حق وصواب کو ان میں محدود ومحصور نہیں سمجھا، اسی لئے خود احناف نے کئی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی آراء اور شوافع نے امام شافعی کی آراء کے خلاف فتاویٰ دیئے ہیں، اور ان مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان کبھی کوئی نزاع، جنگ وجدال اور ایک دوسرے کی مذمت واہانت کی نوبت نہیں آئی، اس ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں مختلف قومیں دامن اسلام میں آئیں، لیکن ان کو کبھی یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش نہیں آتی کہ وہ کس فقہ پر عمل کریں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امت میں دین کے مزاج ومذاق کے بارے میں صحیح فہم تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ دین کے اصول وبنیاد اور اساس نہیں ہے، بلکہ ایسے مسائل ہیں جن میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہے، ان میں ایک رائے پر اصرار اور دوسری رائے کے بارے میں عناد کا رویہ رکھنا صحیح نہیں، اس لئے انہوں نے اس اختلاف کو کبھی اہمیت نہیں دی، علماء کا تو کیا ذکر سربراہان مملکت جن کا اصل میدان سیاست ہے نہ کہ علم وتحقیق، ان کا ذہن بھی اس بارے میں بہت واضح تھا، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس سلسلہ میں مامون الرشید کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، مامون کے زمانہ میں ایک شخص عسائیت کی طرف مُرتد ہوگیا، مامون نے اس پر سزا جاری کرنے سے پہلے اس کو مطمئن کرنے کی غرض سے دریافت کیا کہ تمہارے مُرتد ہونے کا کیا باعث ہوا؟ اس نے کہا کہ تم لوگوں کا اختلاف، مامون نے کہا کہ ہمارے اختلاف دو طرح کے ہیں، ایک تو جیسے اذان کے کلمات، جنازہ کی تکبیرات اور تشہد وغیرہ کے بارے میں تو یہ اختلاف نہیں، بلکہ تنگی کی بجائے توسع اور تخفیف ہے، اسی لئے جواذان واقامت کے دہرے کلمات کہتا ہے وہ اس شخص کو غلط قرار نہیں دیتا جو اقامت کے اکہرے کلمات کہتا ہے، ان فقہی اختلافات کی وجہ سے نہ ہم ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں اور نہ بُرا بھلا کہتے ہیں، لا یتعایرون بذالك ولا یتعاتبون دوسرا اختلاف وہ ہے جو کسی آیت یا حدیث کی تشریح میں ہوتا ہے، اگر تم کو اس سے وحشت ہے تو تورات وانجیل کی تشریح میں بھی علماءِ یہود ونصاریٰ متفق نہیں ہیں، کیونکہ جب کوئی بات تفصیل طلب ہوگی تو اس کی تشریح میں یقیناً اختلاف کا امکان ہوگا، اگر اللہ کو یہ بات منظور ہوتی کہ ان کے

درمیان کوئی اختلاف ہی نہ ہوتو اللہ نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نازل نہ کی ہوتی جو تفسیر وتشریح کی محتاج ہو، مامون کی اس بات نے اس شخص کے ذہن کی گتھی کھول دی، اور وہ فوراً ارتداد سے تائب ہوگیا۔ (عیون الاخبار: ۱۵۴/۲، الردعلی الملحدین)

غرض کہ کچھ مسائل میں اختلاف رائے عہدِ صحابہؓ سے ہے، یہ اختلاف امت کے لئے رحمت ہے اور یہ اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے منشاء کے عین مطابق ہے، اس اختلاف کو مذموم سمجھنا سلف کے طریقہ کے بھی خلاف ہے اور عقلِ سلیم کے بھی مغائر، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اختلافات کے معاملہ میں انسان کا قلب وسیع ہو، تمام سلفِ صالحین کے بارے میں اس کی زبان محفوظ اوراس کا قلم محتاط ہو، وہ صلحاءِ امت کے اختلاف کے بارے میں حسنِ ظن رکھے، اور اختلاف رائے کو برداشت کرے، یہ وہ مسائل نہیں ہیں جن کی امت پر تبلیغ کی جائے، اوراس کو اپنی دعوت کا موضوع بنایا جائے، اسی طرح اعتقادی احکام کی تشریح میں اہلِ سنت والجماعت کے درمیان جو معمولی سا اختلاف ہے، اوراکثر یہ اختلاف محض تعبیر کا ہوتا ہے، ان میں غلو، اوران کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ قرار دینا نہایت ہی مذموم اور ناشائستہ بات ہے۔

جیسا کہ ایک زمانہ میں مغرب کی استعماری طاقتوں نے ان غیر اہم مسائل کو مسلمانوں میں اختلاف بھڑکانے اوران کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا ذریعہ بنایا تھا اسی طرح اس وقت بھی اسلام کے مخالفین اس قسم کے مسائل میں امت کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس قدر مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوگا ان کی راہ آسان ہوگی، وقت کی لکیر کو نہ پڑھنا اور غیر اہم باتوں میں اپنے آپ کو الجھا کر رکھنا کسی قوم کے انحطاط کی علامت ہوتی ہے، ہمیں تاریخ کا وہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب مسلمان فوجیں صلیبیوں کو شکست دی تھیں تو عیسائیوں کے درمیان اس موضوع پر مناظرہ کا بازار گرم تھا کہ زمین افضل ہے یا آسمان؟ ___ کہیں ہم اسی تاریخ کو دھرا تو نہیں رہے ہیں؟؟

(۱۸؍مئی؍۲۰۰۱ء)

اختلاف کا طریقہ

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ امت کے دو بڑے فقیہ صاحب اور صاحب علم اور صاحب فضل بزرگ گذرے ہیں، آج پوری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعداد امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرنے والوں کی ہے، اس کے بعد فقہ شافعی ہی کے مقلدین کا نمبر ہے، امام شافعیؒ کو ہزاروں مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کے رائے سے اختلاف تھا، لیکن فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کی عیال ہیں، (**الناس عيال في الفقه على ابي حنيفةؒ**) یہی امام شافعیؒ ایک بار بغداد آئے، بغداد میں امام ابوحنیفہؒ کی قبر ہے، امام شافعیؒ نمازِ فجر میں سال بھر قنوتِ نازلہ پڑھنے کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اس کے قائل نہیں، البتہ ایسے خصوصی مواقع پر قنوتِ نازلہ کی اجازت دیتے ہیں جب مسلمانوں پر کوئی آفت آئی ہو، امام شافعیؒ نے آج نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ نہیں پڑھی، لوگوں کو تحیر ہوا، عرض کیا گیا: آج آپ نے دعاءِ قنوت نہیں پڑھی؟ فرمایا کہ مجھے اس صاحب قبر سے حیا آتی ہے کہ میں ان کے شہر میں بھی ان کی مخالفت کروں، اختلاف کے باوجود اعتراف واحترام کی یہ ایک مثال ہے اور ایسی بہت سی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد واتفاق کی ضرورت سے کسے انکار ہوگا؟ شاید ہی کسی ایسے شخص کو اس سے اختلاف ہوگا، جو فتورِ عقل سے محفوظ ہو، کیا عالم، کیا جاہل، کیا مسلمان کیا غیر مسلم، اس لئے دن رات اتحاد واتفاق کی اہمیت پر تقریریں بھی ہوتی ہیں، مضامین بھی لکھے جاتے ہیں، بلکہ بڑی بڑی کانفرنسیں خاص اسی مقصد کے لئے منعقد کی جاتی ہیں، اب تو اس کے لئے جلوس اور ریالیاں بھی نکالی جاتی ہیں اور مشاعروں اور سمیناروں کا بھی

اہتمام کیا جاتا ہے، یہ بھی بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کس طرح اتحاد و یکجہتی کو قائم رکھا جائے؟

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسانی سماج میں اختلاف کا واقع ہونا بھی ایک ایسی ناگزیر بات ہے، جس سے مفر نہیں، اگر سونے چاندی یا مٹی اور پتھر کی مورتی بنادی جائیں، ان کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے، تو یقیناً اختلاف نہ ہوگا، نہ کوئی اپنی جگہ سے آگے بڑھے گی، نہ پیچھے ہٹے گی، نہ ایک دوسرے کے خلاف اظہارِ خیال کرے گی، لیکن چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، جیتے جاگتے انسان کو اس طرح متفق اور مہر بہ لب رکھنا ممکن نہیں، خدا نے بھی جو عقل ودیعت فرمائی ہے، وہ سوچ اور غور و فکر کے بغیر رہ نہیں سکتی، یہی اس کی غذا ہے اور جیسے اللہ نے ناک، کان، رنگ و روپ اور چال ڈھال میں ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے مختلف بنایا ہے، اسی طرح ان کی عقل و فہم کی صلاحیت بھی مختلف ہے اور الگ الگ سمتوں کو لے جاتی ہے، اس لئے ان کے درمیان اختلاف فطری بھی ہے اور ضروری بھی، یہی اختلاف ہے جو انسان میں جذبۂ مسابقت پیدا کرتا ہے، اپنی رائے کی خامیوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں انسان کو رواں دواں رکھتی ہے۔

اس لئے جیسے ''اتحاد'' سیکھنے کی ضرورت ہے، اس لئے ''اختلاف'' بھی سیکھنے کی ضرورت ہے، کہ اگر کسی شخص سے اختلاف ہو جائے، تو آپ کا کیا رویہ ہونا چاہئے اور اختلاف کا اظہار کس طرح کرنا چاہئے؟ اور تو جہاں تک ممکن ہو اختلاف سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، بعض لوگوں کا مزاج بن جاتا ہے کہ جب بھی کوئی ایسی مجلس ہو جہاں مختلف نقطۂ نظر کے حامل موجود ہوں، وہاں ایسی ہی بات سے آغاز کرتے ہیں، جو اختلافی ہو، طنز و تعریض کی زبان استعمال کرتے ہیں اور تمسخر و استہزا کر کے اپنے مخالفین کو بے آبرو کرنا بڑا فن خیال کرتے ہیں، یہ محض جہالت کی بات ہے، آپ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، تو یہاں آپ ﷺ کے مخاطب یہود تھے، یہود مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور کوئی موقع مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، لیکن قرآن مجید

نے ان سے بھی کہا کہ ایک ایسی بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدرِ مشترک ہے، یعنی توحید" تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ " (آل عمران:۶۴) اس لئے مشترکہ مجلسوں میں اس سے خوب احتراز کرنا چاہئے۔

دوسرے: ہر انسان میں خامیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں، خدا کی کوئی مخلوق ایسی ناقص نہیں ہوسکتی کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو ہی نہ ہو، ان خوبیوں کا پوری کشادہ قلبی اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہئے، یہی اس کے ساتھ انصاف ہے۔ اس کی خامیوں کو یاد رکھنا اور اس کی خوبیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹادینے کی کوشش کرنا بھی ناانصافی ہے، قرآن مجید نے اسی لئے ہدایت دی ہے کہ "کسی قوم کی برائی اس کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کرنے میں حارج نہ ہوجائے"۔ "لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا" زمانۂ جاہلیت کا ایک شاعر "امیہ بن صلت" تھا، کافر تھا اور کفر ہی پر اس کی موت ہوئی، اس کے بعض اشعار بڑے اچھے تھے اور حقائق پر مبنی تھے، آپ ﷺ اس کے اشعار کے محاسن کا برملا اعتراف فرماتے تھے۔

تیسری: اہم بات یہ ہے کہ اختلاف برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہیے، فرد ہو یا ادارہ، جماعت ہو یا تنظیم، آج کل مسلمانوں میں مشورہ سے عمل کرنے کا فقدان ہوتا جارہا ہے، کیوں کہ مشورہ میں اس شخص کی رائے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، اس کی رائے کے خلاف بھی فیصلہ ہوسکتا ہے، اس کا محاسبہ بھی ہوسکتا ہے اور اختلاف واحتساب کو برداشت کرنے کی قوت ہی نہیں رہی، بعض لوگ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی بداعمالی پر پردہ پڑا رہے اور بعض لوگ اس کو وقار کا مسئلہ سمجھتے ہیں، یوں تو اخلاص کا تعلق دل سے ہے، لیکن اپنے آپ کو "احتساب کے لئے تیار رکھنا" اخلاق کو جانچنے کی کسوٹی ہے، جس کا کام خدا کے لئے ہو، اس کو یہ فکر نہ ہوگی کہ اس کی رائے چلے اور نہ اسے اپنے احتساب سے خوف ہوگا، بلکہ وہ اسے پسند کرے گا کہ دنیا میں ہی حساب ہوجائے اور آخرت میں اس کا حساب آسان ہو۔

چوتھے: اختلاف میں بھی صلح ومحبت کا انداز ہونا چاہئے، نہ کہ اہانت کا، رسول اللہ ﷺ کو

کسی کی کوتاہی پر تنبیہ کرنا ہوتی تو اس میں محبت کا رنگ کارفرما ہوتا، اگر کسی کی انفرادی کوتاہی پر ٹوکنا ہوتا، تو تنہائی میں بلا کر کہتے، اگر مختلف لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہوتے، تو کسی کا نام لئے بغیر متوجہ فرماتے، تا کہ کسی کی اہانت نہ ہو، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کسی سے اختلاف ہو تو اس کی ایک ایک کمزوری کو تلاش کرتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس قدر بدنام ہو جائے کہ کہیں منہ دکھانے کے لائق باقی نہ رہے!

بدقسمتی سے آج اختلاف مسلمانوں کی پہچان ہوگئی ہے، کوئی تنظیم ہو، ادارہ ہو، جماعت ہو، تحریک ہو، مسجد ہو، مدرسہ ہو، گھر ہو کہ سماج کا ماحول ہو، ہر جگہ دل ٹوٹے ہوئے اور کینہ و کدورت سے لبے ہوئے، کیوں کہ جو لوگ کسی ذمہ داری پر فائز ہیں ان میں اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں، ان میں اختلاف کا سلیقہ نہیں، اختلاف کا یہ انداز قدم قدم پر قوم کی ترقی میں رکاوٹ ہے، کاش! ہم اختلاف کے ساتھ اختلاف کا طریقہ سیکھیں اور ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر چہار سمت سے عداوت و حسد کے تیر اس امت پر گر رہے ہیں، ہم اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی کا سرو سامان نہ کریں!!

(۲۸/اپریل ۲۰۰۰ء)

بخش دو گر خطا کرے کوئی!

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (متوفی ۶۲۷ھ) ان بزرگوں میں ہیں جن کے مسکن ہونے پر ہندوستان کو بجا طور پر فخر ہے، ان کی انسانیت دوستی اور اخلاق و مروت کی وجہ سے ہر مذہب کے لوگ ان کے گرویدہ تھے، انہوں نے ایک ایسے علاقہ میں اپنی درویشی کا تخت بچھایا اور رشد و ہدایت کی محفل آراستہ کی، جہاں کی تندخوئی اور درشت طبعی ضرب المثل تھی اور آج بھی ایک حد تک ان کی یہ شناخت قائم ہے، یہ آپ کی نرم خوئی اور کریمانہ اخلاق ہی کی دین ہے کہ تلوار سے بھی جن گردنوں کو خم کرنا دشوار تھا، آپ کے ہاتھوں میں ان کا دل موم ہو جاتا تھا، ہندو ہوں یا مسلمان، سب آپ کے معتقد تھے، لاکھوں اشخاص نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور فسق و فجور سے تائب ہوئے۔

خواجہ صاحبؒ کا ایک نمایاں وصف عفو و درگذر تھا، ایک دفعہ ایک شخص کسی کے بہکاوے میں آکر آپ کے قتل کے درپے ہوگیا اور اسی ارادے سے حاضر مجلس ہوا، کسی طرح آپ نے اس کا ادراک کرلیا، آپ نہایت سیر چشمی سے ملے، اخلاق سے پیش آئے، پھر فرمایا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اسے پورا کرلو، وہ بہت کانپنے لگا، بغل سے چھری نکال کر سامنے رکھ دی اور قدم بوس ہو کر عرض گذار ہوا کہ مجھے میری غلطی کی سزا دیجئے، بلکہ مجھے ہی قتل کر دیجئے، آپ نے فرمایا: ہم درویش تو تکلیف پہنچانے والوں اور بُرائی کرنے والوں کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے، تم نے تو کوئی بُرائی کی ہی نہیں، آخر اس شخص نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور زندگی میں ایسی تبدیلی آئی کہ یا تو لوگوں کے جان و مال کے درپے رہتا تھا یا ایسا خدا ترس اور عبادت گذار ہوا کہ متعدد بار حج کی زیارت سے

سرفراز ہوا۔

جانی دشمنوں کو معاف کرنے اور اخلاق کی تلوار سے فولاد و آہن کی تلوار کو مفتوح کرنے کی یہ ایک مثال ہے، صحابہ کرامؓ، داعیانِ اسلام اور صوفیاء و عارفین کی زندگی میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں، ''معاف کرنا'' بولنے میں ایک آسان لفظ ہے، لیکن عملی زندگی میں یہ ایک دشوار کام ہے، جان و زندگی کے در پے ہونا تو بڑی بات ہے، معمولی بے توقیری یا زمین و جائیداد اور روپے پیسے کا جھگڑا بھی انسان کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، جب انتقام کی آگ سلگتی ہے تو انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا، بے قابو ہو جاتا ہے، ایسے ہی وقت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کمال ہے۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق ﷜ حق کے معاملہ میں بہت پُر جوش واقع ہوئے تھے، کوئی غلط بات دیکھتے تو برداشت نہ کرسکتے، اسی لئے حضور ﷺ فرماتے تھے کہ عمر جس راہ سے جاتے ہیں، شیطان اس سے کترا کر نکل جاتا ہے، حضرت عمر ﷜ کا معمول تھا کہ روزانہ شب میں گشت فرماتے تھے کہ لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے واقف ہوسکیں، ایک دن نکلے تو ایک مکان سے نغمہ و سرور کی آواز سنی، ذرا جھانکا تو دیکھا کہ جام و سبو کا دور بھی چل رہا ہے، حضرت عمر ﷜ سے صبر نہ ہوسکا، دیوار پھاند کر اندر آگئے اور کہا کہ دشمن خدا! تو شراب بھی پی رہا ہے اور گانے بھی باندی سے سن رہا ہے! وہ صاحب بھی حضرت عمر ﷜ کے مزاج سے واقف تھے، عرض کیا کہ امیر المومنین! کچھ عرض کرنے کی اجازت ہو، آپ ﷜ نے اجازت مرحمت فرمائی، کہنے لگا: مجھ سے دو غلطیاں ہوئی ہیں اور آپ سے قرآن مجید کے تین احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے، قرآن نے تجسس سے منع کیا ہے، (الحجرات:۱۲) آپ نے میری کوتاہیوں کی بابت تجسس کیا، قرآن مجید نے کہا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو، (النور:۲۷) آپ بلا اجازت داخل ہوگئے، قرآن نے کہا ہے کہ دروازے سے آؤ، (البقرہ:۱۸۹) آپؓ دیوار پھاند کر آگئے، حضرت عمر ﷜ کا غصہ کافور ہوگیا اور فرمایا کہ کیا میں ان تین باتوں کی وجہ سے تمہاری دو باتوں کو نہ معاف کردوں، اس شخص نے اثبات میں جواب دیا

اور آپ واپس تشریف لے آئے، اس پر حضرت عمرؓ کے صبر و حلم اور عفو و درگذر کا گہرا اثر ہوا اور اپنی خراب عادتوں سے توبہ کر لی۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، وہ شخص کہ جس کے نام سے روم و فارس کے ایوانِ حکومت لرزہ براندام ہو جاتے تھے، خود حکمِ ربانی کے سامنے آتے ہی سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔ رضی اللہ عنہ

غصہ اور جذبۂ انتقام پر صبر و حلم کو غالب رکھنے کا نام عفو و درگذر ہے، ایک ایسا شخص جو کوئی بدسلوکی کرنے والے پر قابو رکھتا ہو، وہ اسے کچل سکتا ہو، اس سے بدلہ لے کر بلکہ جائز انتقام کی حد سے تجاوز کر کے اپنی پیاس بجھا سکتا ہو، خیال کرے کہ وہ صبح و شام اور دن و رات اللہ کا حکم بجالانے میں کوتاہی کرتا ہے، خدا کتنا قادرِ مطلق ہے اور کیسی بے پناہ قدرت و طاقت رکھتا ہے، پھر بھی اس نے کس طرح نافرمان اور سرکش بندوں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے رکھا ہے، اگر ہم خدا کے ایک بندے کے ساتھ درگذر کا معاملہ کریں تو خدا کا سایۂ درگذر ہم پر اور بھی دراز ہو جائے گا، تو اس طرح اس کے لئے معاف کرنا آسان ہو جائے گا، ایک بار ایک صحابی کسی غلطی پر اپنے غلام کو مار رہے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ پڑی، آپ ﷺ نے آواز دی اور فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور ہاں، یاد رکھو کہ تم کو اس غلام پر جتنی قدرت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے، یہ سننا تھا کہ وہ صاحب کانپ گئے اور کہا کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا۔

جب انسان کسی معاملہ کو اپنے اور دوسرے کے درمیان رکھ کر سوچتا ہے، تو غصہ بڑھتا ہے اور انتقام کی چنگاری شعلہ بن اٹھتی ہے اور وہی شخص جب اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان خدا کو رکھ کر سوچتا ہے تو غضب کی آگ محبت کی شبنم میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاف کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں ایک لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ کڑوی کسیلی برداشت کر لینے میں بے عزتی ہوگی، رعب و وقار جاتا رہے گا، بدباطن لوگ بھی اس طرح کی بات کہہ کر اکساتے ہیں اور آگ پر تیل چھڑکتے ہیں، پیغمبرِ اسلام سے بڑھ کر نفسیات سے کون واقف ہوگا، اسی طرح

کی نفسیات کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو معاف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتے ہیں، یہ بڑی اہم بات ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، ایک تو اس شخص کی تسکین ہوتی ہے جو غصہ پر قابو پانا چاہتا ہے، دوسرے یہ حقیقت بھی ہے کہ منتقم مزاج کا بھلے ہی ظاہری اور عارضی رعب قائم ہو جائے، لیکن ہر شخص کا دل اس سے نفرت کرتا ہے اور صابر و حلیم گو وقتی طور پر بے عزتی کو گوارا کر لے، لیکن دِلوں پر اس کی محبت کا نقش ثبت ہوتا ہے اور سماج میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔

(۱۴/اپریل ۲۰۰۰ء)

صبر خوش تدبیری ہے نہ کہ بزدلی

انسان کا جسم کتنی ہی بیماریوں کا مخزن ہے، یہ بیماریاں ہی ہیں جو انسان کو اس کے عجز و ناطاقتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں، اور بہت سے غفلت شعار قلوب واذہان کے لئے یہی خدا کو یاد کرنے کا سامان ہیں، ان ہی بیماریوں میں ایک مشہور اور ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے آج کل کثیر الوقوع بیماری وہ ہے جسے ''الرجی'' اور ''حسامیہ'' کہتے ہیں، اطباء کا خیال ہے کہ جسم میں بعض جراثیم قوت برداشت کھو دیتے ہیں، جیسے ہی کوئی بیرونی اور ناموافق چیز جسم میں داخل ہو، یہ فوج حرکت میں آجاتی ہے، اور غیر معمولی ردِ عمل ظاہر کرتی ہے، پھر تو مریض کا حال نہ پوچھئے، چھینکوں کا ایک طوفانی سلسلہ'' ناک اور آنکھ سے تو گویا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے''، پھر سینہ وحلق اور پیشانی تک بلغم کی تہیں جمتی ہیں، اور دِنوں، ہفتوں کھانس کر مریض بے سدھ ہو جاتا ہے، یہ بڑی تکلیف دہ بیماری ہے، بلکہ بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔

جیسے جسمانی سطح پر الرجی انسان کو کمزور کر دیتی ہے، اور اس کے معتدل کیفیت کو زیر وزبر کر کے رکھ دیتی ہے، اسی طرح قومیں بھی ''الرجی'' سے دوچار ہوتی ہیں، بعض قوموں اور گروہوں میں برداشت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور ردِ عمل کی کفیت بڑھ جاتی ہے، وہ بات بات پر مشتعل ہوتی ہے، مخالفین کا ایک بیان مہینوں ان کو الجھا کر رکھتا ہے، اور بے برداشت ہونے کی وجہ سے ایسی جذباتیت کا ان سے مظاہرہ ہوتا ہے، جس کا نقصان خود ان کو پہونچتا ہے، ایسی قومیں دشمنوں اور بدخواہوں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے حقیقی مسائل کی طرف توجہ نہیں دے پاتیں، ہمیشہ ردِ عمل میں الجھی رہتی ہیں، دوسری قومیں

تعلیمی، معاشی اور دوسرے پہلوؤں سے آگے بڑھتی رہتی ہیں، اور یہ سنہرا وقت مشتعل مزاج قوم ماتم وزاری اور سینہ کوبی میں گذار دیتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان اس وقت ان ہی حالات سے گذر رہے ہیں، ہم ایک طرح کی قومی الرجی میں مبتلا ہیں، ہمیں مشتعل کرنے کے لئے بے بنیاد افواہیں بھی کافی ہیں، ایک غیر معروف شخص بھی اگر کوئی معاندانہ بات کہہ دے، تو ہم لحوں میں سڑک پر آجاتے ہیں، اور اس شدت سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں کہ معمولی شخص ہیرو بن جاتا ہے، اور معمولی تحریریں جن کی اصل جگہ ردِّی کی ٹوکری ہے، محض تجسس میں قبولِ عام و خاص حاصل کرلیتی ہیں، اس مزاج کا نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے پایا بہت کم ہے اور کھویا بہت زیادہ ہے، کچھ چیزیں یقیناً ایسی ہیں جن کے بارے میں حکومت سے ہمارا شکوہ بجا ہے، لیکن بہت سی چیزیں وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے میں ہم حکومت کے محتاج نہیں ہیں، مسلمانوں میں خواندگی کی سطح سب سے کم ہے، ہماری خواتین کا تعلیمی تناسب کم نہیں، کمترین ہے، معمولی اور اوسط درجے کی تجارت جو سرکاری اجازت سے متعلق نہیں ہیں، ان میں بھی ہم بہت پسماندہ ہیں، زراعت میں نئے وسائل کے استعمال کی اہمیت کو اب تک ہم نے نہیں سمجھا ہے، حکومت کے بہت سے فلاحی پروگرام ہیں، اور بعض فلاحی پروگرام بین الاقوامی تنظیموں کے تحت انجام پاتے ہیں، مسلمان ان فلاحی پروگراموں سے بھی واقف نہیں، ان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

حالانکہ مسلمانوں کے پاس بہترین ذہانتیں ہیں، افرادی وسائل ہیں، وہ اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، مسلمان مزدوروں اور ہنرمندوں کے بیرونی ممالک میں جانے سے ان کی معاشی حالت میں بھی فرق آیا ہے، مذہب سے جتنا تعلق آج بھی مسلمانوں کو ہے کسی اور قوم کو نہیں ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ ہماری پسماندگی کا کوئی علاج نہیں ہو پاتا ____ اس کی ایک اہم وجہ یہی اشتعال اور تحمل و برداشت کا فقدان ہے، ہم وقتی حالات پر اتنا سخت ردِعمل ظاہر کرتے ہیں، کہ ہماری پوری قوت وصلاحیت یا اس کا بڑا حصہ دفاعی کوششوں میں گذرتا ہے، اور ہم کوئی طویل العمل دوررس اثر کی حامل، ٹھوس اور تعمیری

منصوبہ بندی نہیں کر پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سیاسی حالات کی ناموافقت نے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے، اور اب انہوں نے دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اعتمادی کے ساتھ جینے کا حوصلہ سیکھا ہے، بحمد اللہ پورے ملک میں مسلمان ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور فنی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں، دینی تعلیم کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے، ملازمت سے مایوس ہو کر تجارت کی طرف ان کے قدم بڑھ رہے ہیں، اور سیاست کی سنگلاخ وادی میں آبلہ پائی کرنے کی بجائے اب ان کی توجہ ایک طرف اگلی نسلوں کے ایمان کی حفاظت اور دوسری طرف تعلیم اور معیشت کی طرف ہو رہی ہے، یہ صورتِ حال فرقہ پرست قوتوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے، اور وہ اس بات کے لئے سرگرداں ہیں کہ اس قوم کو دوبارہ اس کی بیماری میں مبتلا کریں، اسے مشتعل کریں، اس کے جذبات کو اکسائیں، اس کی انا کو ٹھیس لگائیں، اس کو بے برداشت کریں، تاکہ تعمیر سے اس کا ذہن ہٹ جائے اور یہ قوم ایسی ڈور کو سلجھنے میں لگ جائے جس کے سلجھنے کا اسے ایک پائی بھی فائدہ نہیں، اور جس میں اس کی انرجی اور صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہو کر رہ جائے۔

ادھر کبھی وی، ایچ، پی کی طرف سے مسجد اور مندر کے مسئلہ کو گرم کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی بجرنگ دل نے علانیہ مسلمانوں کے خلاف عسکری تربیت کے کیمپ قائم کئے، کبھی بیان دیا گیا کہ مسلمانوں پر نظر رکھی جائے گی، جناب بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کو سانپ کہا، اور ان کی گرفتاری کے مسئلہ کو بھی پر جوش اور پر خروش بنانے کی کوشش کی گئی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے ان خبروں کو اخبار میں پڑھا، ریڈیو سے سنا، اور دیکھی ان دیکھی اور سنی ان سنی کر دی، مسلمان قائدین نے بھی مسئلہ کو سڑک پر لانے کے بجائے صحافتی بیانات اور حکومت کو توجہ دلانے پر اکتفا کیا، اس طرح بات آئی گئی ہو گئی، ورنہ یہ چنگاری آتش فشاں بننے کے لئے کافی تھی، مسلمان نوجوان سڑکوں پر آتے، فسادات ہوتے، مظلوم اور بے کس مسلمانوں پر پولیس مشق ناز کرتی، مجرم ان کی بے بسی پر قہقہے لگاتے، اور مظلوم صعوبت خانوں میں نشانہ جور بنتے ___ ان اشتعال انگیز بیانات کا اصل مقصد یہی

تھا، لیکن مسلمانوں نے اپنی سمجھ داری کے ذریعہ اس سازش کو نا کام کیا ہے۔

یہ بزدلی نہیں، بلکہ خوش تدبیری ہے، یہ فرار نہیں، بلکہ دشمن کے وار کو خالی کرنا ہے، یہ ہزیمت نہیں، بلکہ معاندین کی سازشوں کو ناکام و نامراد بنانا ہے، اور اس لئے یہ شکست نہیں بلکہ فتح مندی اور ظفریابی ہے ــ قرآن کی زبان میں اس کا نام ''صبر'' ہے۔ صبر صرف شخصی مصیبت کو سہنے کا نام نہیں، بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی میں ضبط وتحمل کا راستہ اختیار کر کے دشمن کے عزائم کو ناکام بنانے کا نام بھی صبر ہے، صبر سے انسان دوہرا فائدہ اٹھاتا ہے، ایک تو اپنی قوت کے ضائع ہونے سے بچتا ہے، دوسرے اپنے تعمیری کام میں تسلسل کو برقرار رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آخرت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے، کہ صبر پر دوہرا اجر دیا جائے گا، ''اولئك یوتون اجرهم مرتین بما صبروا'' (القصص:۵۴) اس میں گویا اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ دنیا میں بھی صبر دوہرے فوائد کا حامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آخرت کی مثال بنا کر پیدا کیا ہے۔

''صبر'' کامیابی اور ظفرمندی کی کلید ہے، اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے بارے میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ ان کے صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ انعام ان کے حق میں پورا ہوا، ''تمت کلمة ربك الحسنى على بني اسرائيل بما صبروا'' (الاعراف:۱۳۷) صبر میں بہ ظاہر ہزیمت محسوس ہوتی ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مژدہ فتح و نصرت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ'' (البقرہ:۱۵۵) کہ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنائیے، قرآن نے یہ بات بہت واضح طریقہ پر کہی ہے کہ اللہ کی نصرت کو پانے کا ذریعہ دو چیزیں ہیں، صبر اور صلاۃ، اور پھر خاص طور پر صبر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، ''یا ایها الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلاة ان الله مع الصابرین'' (البقرۃ:۱۵۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص مال یا جان کے معاملہ میں آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے، اور وہ لوگوں سے اس کا شکوہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کر دے، (مجمع الزوائد:۱۰/۲۵۶)

جیسے یہ بات افراد کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، یہی بات قوموں اور گروہوں کے بارے میں کہی جائے تو بے جا نہ ہو، کہ جو قوم دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر کھڑی رہے، اور محض ناانصافی کا رونا روتی رہے، وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ جاتی ہے، اور جو قوم اللہ پر بھروسہ کر کے ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتی جائے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، اور اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن رہتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے امن اور ہدایت ہے: **"اولئك لهم الامن وهم مهتدون"** (مجمع الزوائد: ۱۰/۲۸۴) یعنی صبر کی وجہ سے امن وامان کی حالت رہتی ہے، اور وہ صحیح راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، مکی زندگی میں صحابہؓ بار بار قتال کی اجازت مانگتے لیکن آپ ہمیشہ صبر کی تلقین فرماتے رہے، مدینہ میں منافقین نے مسلمانوں کو کس طرح دق کیا، اور بغلی دشمن کا کردار ادا کیا، حضرت عمرؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت چاہی، یہاں مسلمان طاقت ور موقف میں تھے، اور وہ منافقین کو کیفر کردار تک پہونچا سکتے تھے، لیکن آپ ان کی گستاخیوں اور ایذا رسانیوں کو برداشت کرتے رہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر انہیں قتل کیا جائے، تو لوگ ان کے نفاق سے واقف نہیں ہیں، عرب سمجھیں گے کہ دیکھو پہلے دشمنوں پر ہاتھ اٹھاتے تھے، اب طاقت ہوئی تو اپنوں پر تلوار اٹھانی شروع کر دی، صلح حدیبیہ بہ ظاہر آپ نے کتنی دب کر فرمائی، کہ پُر جوش صحابہؓ کو بھی یہ صلح ناگوار خاطر تھی، اور محض آپ ﷺ کے احترام میں وہ خاموش تھے، اس صلح کو سبوتاج کرنے کی بھی کوشش کی گئی کہ چالیس مشرکین کے جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، وہ گرفتار کئے گئے، اور آپ ﷺ نے انہیں یونہی رہا فرمادیا، کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر اہلِ مکہ سے تعلقات بہتر ہوں، تاکہ وہ قریب سے اسلام کو دیکھ اور سمجھ سکیں، فتح مکہ کے موقعہ سے بھی آپ نے جو عفو و درگذر سے کام لیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عربوں کے درمیان حرم کی جو حرمت تھی، اس سلسلہ میں مسلمانوں

کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

غرض، غور کیجئے تو آپ ﷺ کی پوری زندگی صبر سے عبارت ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے اصل کام سے غافل اور دور نہ ہو جائیں، یہی صبر ہے جس کی ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ضرورت ہے، ہم بزدل اور کم ہمت نہ ہوں، ہم کوتاہ حوصلہ اور بے غیرت بن کر نہ جئیں لیکن ہم اپنی فراستِ ایمانی کی آنکھ کو کھلی رکھیں، اور دشمن کی سازش اور منصوبہ بندی کو سمجھیں، اور دوسرے کے ہنگامہ سے متاثر ہو کر راستہ میں اس طرح نہ الجھ جائیں کہ کبھی ہماری منزل نہ آسکے، اسی خوش تدبیری اور معاملہ فہمی کا نام ''صبر'' ہے۔

(۲۵/ اگست ۲۰۰۰ء)

صلح کرانا — ایک اہم اسلامی فریضہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا بولتا، اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے، اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لئے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور وہ پتھر کی مورتوں کی طرح خاموش اور بے زبان رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے، اور اس سے کوئی مفر نہیں، اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد، انا اور خود غرضی کی وجہ سے ہو تو یہ مہذب اور شائستہ اختلاف رائے کی حدوں سے گذر کر باہمی جنگ و جدال، قیمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ — قرآن اللہ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی ہے — کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں، اور تیسرے وہ سماج اور معاشرہ جس میں اس طرح کی نزاع پیش آتی ہو، قرآن کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے

طور پر اس فاصلہ کو سمجھنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دین دار، سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں، اور ان کو اپنا ''حکم'' مان لیں، یہ دونوں حکم کی حیثیت سے جو بھی فیصلہ کریں اسے دونوں فریق قبول کرلیں، اور حکم حضرات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن کہتا ہے کہ اگر حکم طرفدار بنے بغیر نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں گے: ''اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ''. (النساء:۳۵)

صلح اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ ہے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ''انا'' کے خول سے باہر آئے، بڑائی کے احساس سے اپنے ذہن کو فارغ کرے، اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حقائق کو قبول کرنے کی جرأت ہو، اور اس کی نگاہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو،

تیسرا طبقہ جو دو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرادیا کرو۔ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ '' (الحجرات:۱۰) یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادراک ہے اور نہ احساس۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ،

صدقہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل چیز نہ بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاح ذات البین، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے، (الادب المفرد، حدیث نمبر:۳۹۱) ''مونڈ دینے والی چیز'' سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کر دینے اور تباہ و برباد کر دینے والی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس ولحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ کو حد درجہ اہتمام تھا، عین میدان جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی، اور مرضِ وفات میں اس وقت بھی آپ ﷺ نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لئے آپ اپنے رفقاء کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال ﷺ نے حضرت ابوبکر ﷺ کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، (بخاری حدیث:۲۶۹) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی؟

مدینہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست وگریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لئے ابر رحمت بن کر آیا، اور صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھائے نہ بجھتی تھی وہ لمحوں میں سرد ہو کر رہ گئی، اور دونوں قبیلے اُخوت اسلامی کے رشتہ سے شیر وشکر ہو کر رہنے لگے، یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اوس وخزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا اور ان کی باہمی محبت کو دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا، چنانچہ اس نے اوس وخزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دئے اور اس زمانہ میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف مذمت کے جو اشعار کہے تھے، ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، رسول اللہ ﷺ

کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی، بہت تیز تیز تشریف لائے، لوگوں کو شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا اسی موقع سے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم پر اسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہئے۔ سب مل کر اللہ کی ڈوری کو تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو، اور اپنے اوپر اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڈھے کے کنارہ پر تھے، تو اللہ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام بتاتے رہتے ہیں، تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو، (آل عمران: ۱۰۲، ۱۰۳)

—— زبانِ مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے، اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی: ۲۰/۴)

غرض، کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف ونزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے، تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنالے گی، اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کر کے رہے گا، اس لئے مسلمانوں میں جو "اربابِ حل وعقد" ہوں، یعنی ذمہ دار، سمجھ دار، بااثر اور اہلِ علم ودانش، علماء ومشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین، ملی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں ابھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب وعوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عند اللہ وہ اس سلسلہ میں جوابدہ ہونگے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں، مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں، اصلاحی تحریکیں ہیں، ان میں سے اکثر اختلاف وانتشار سے دوچار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دولخت بلکہ سہ لخت

ہو چکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے اور پھر ان ٹکڑوں کے کئی ٹکڑیاں، یہ اختلاف و انتشار اور صلاحیتوں کا بٹوارہ بحیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کمزور اور بے اثر کر دیتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی بھی جمہوری ملک میں سیاسی احوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خاص کر اقلیتوں کے لئے ان کے ووٹ کی بڑی اہمیت ہے، اگر مسلمان سیاست کی ترازو میں بے وزن ہو جائیں تو اس ملک میں کوئی بھول کر بھی ان کو پوچھنے والا اور اشک شوئی کرنے والا نہ ہوگا، اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دوست دشمن سبھوں کو اقرار ہے، لیکن افسوس کہ مسلم جماعتوں کی باہمی آویزشوں اور اختلاف نے ان کو بے وزن کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے ان حالات میں سربرآوردہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف مسلم جماعتوں کی باہمی رقابتوں کا قابل قبول حل تلاش کریں ان کو ایک میز پر جمع کریں اور ان کو اختلاف کے باوجود اتحاد پر آمادہ کریں، یہ وقت کا سب سے بڑا اجہاد اور موجودہ حالات کی سب سے بڑی ضرورت ہے!

(۲۷/اگست ۱۹۹۹ء)

خداترس قیادت

بنوامیہ میں ساتویں حکمراں حضرت عمر بن عبدالعزیز ہوئے، بنوامیہ کا عہد عام طور پر ظلم و جور کا عہد رہا ہے، اس دور میں حضور ﷺ کے اہلِ بیت پر لرزہ خیز مظالم ہوئے، نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے رفقا اور اکثر اہلِ بیت کے ساتھ مظلومانہ شہید کئے گئے، مکہ پر ایسی فوج کشی کی گئی کہ بیت اللہ شریف کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، مدینہ منورہ پر ایسا حملہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور بدمست حملہ آور، خواتین کی بے آبروئی سے بھی باز نہ رہے، حجاج ابن یوسف جیسا شخص بنوامیہ ہی کے دور میں ''مدارالمہام'' بنا، جس پر سینکڑوں صحابہؓ کا خونِ ناحق ہے اور جس کے بارے میں حسن بصریؒ نے کہا کہ اگر تمام امتیں اپنے اپنے ظالموں کو پیش کریں اور امتِ محمد یہ حجاج کو، تو حجاج کے ظلم کا پلڑا جھک جائے گا، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عدل وانصاف گویا بنوامیہ کے مظالم کا کفارہ ہے، جس نے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کردی، اس لئے آپ کو ''عمر ثانی'' بھی کہا جاتا ہے اور آپؒ کا ننہالی سلسلہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نازونعم کے پروردہ تھے اور خلافت سے پہلے ان کی نازک اندامی ضرب المثل تھی، جس گلی سے گزر جاتے، پوری گلی معطر ہوجاتی، ۱۰ر صفر جمعہ ۹۹ھ کو سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد زمامِ اقتدار آپؒ کو سونپی گئی، خلافت کی ذمہ داری نے آپؒ کی زندگی کا نقشہ ہی تبدیل کردیا، اب آپؒ کی زندگی کتنی سادہ تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، جسے ابنِ حکم نے ''سیرت عمر بن

عبدالعزیز'' (ص: ۱۷۷) میں نقل کیا ہے، کہ عراق سے ایک خاتون آپ سے باریابی کے لئے آئیں، جب آپ کے گھر پہنچیں، تو معلوم ہوا کہ یہاں نہ دربار ہے نہ دربان، دریافت کیا کہ خلیفہ کے دولت خانہ پر کوئی باڈی گارڈ بھی نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، عام اجازت ہے۔

گھر میں ان کی ملاقات فاطمہ نامی خاتون سے ہوئی، یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زوجہ تھیں، جو معمولی حالت میں بیٹھی روئی درست کر رہی تھیں، خاتون نے سلام کیا، فاطمہ نے جواب دیا اور اندر آنے کی خواہش کی، آنے والی خاتون نے پورے گھر پر ایک نگاہ تجسس ڈالی اور دیکھا کہ خلیفہ کے گھر میں کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہیں ہے، یہ صورتِ حال ان کے لئے مایوس کن تھی، بے ساختہ زبان سے نکلا: ''ہائے میں اس ویران و برباد گھر سے اپنے گھر کو آباد کرنے کی اُمید لے کر آئی ہوں!'' فاطمہ نے کہا کہ: ''تمہیں جیسے لوگوں کے گھروں کو آباد کرنے کی کوشش میں اس گھر کا یہ حال ہو گیا ہے''۔

تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیز بھی آئے، مکان کے ایک گوشہ میں کنواں تھا، آپ نے خود اس سے پانی کھینچا اور مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر پانی ڈالنا شروع کیا، آپ پانی بھی کھینچتے جاتے اور بیوی فاطمہ کی طرف بار بار دیکھتے بھی جاتے، نو وارد خاتون نے ان کو معمولی مزدور سمجھا اور ازراہِ خیر خواہی فاطمہ سے کہا: اس مٹی کا کام کرنے والوں مزدور سے پردہ کا خیال رکھو، میں دیکھ رہی ہوں کہ بار بار وہ تمہیں گھور رہا ہے، فاطمہ نے جواب دیا: وہ مزدور نہیں ہیں، امیرالمومنین ہیں! اس کام سے فارغ ہو کر حضرت عمر صحن سے اندر آئے، کمرہ میں ایک طرف مصلّٰی بچھا ہوا تھا، جہاں آپ نماز ادا کیا کرتے تھے؟ وہیں بیٹھے اور اپنی بیوی سے نو وارد خاتون کے بارے میں دریافت فرمایا، بیوی نے تعارف کرایا، ایک تھیلی میں کچھ انگور رکھا ہوا تھا، حضرت عمرؒ اٹھے اور اس میں سے کچھ انگور ان مہمان خاتون کے لئے منتخب کئے، پھر ان کی ضروریات دریافت کی۔

خاتون نے کہا میری پانچ لڑکیاں ہیں، لوگوں کے لئے ان سے نکاح کرنے میں

رغبت کا کوئی سامان نہیں، میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ ان کے گذران کا کچھ سامان کریں، یعنی ان کے لئے کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے، حضرت عمرؒ پر ان کی بے کسی کا حال سن کر گریہ طاری ہو گیا، رونے لگے، قلم دوات لیا اور والی عراق کے نام خط لکھنے لگے، آپؒ ان کی ایک ایک لڑکی کا نام پوچھتے جاتے اور ان کے لئے وظیفہ مقرر کرتے جاتے اور ضرورت مند خاتون ''الحمد للہ'' کہتی جاتیں، جب چار لڑکیوں کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو خوشی میں بے ساختہ زبان سے آپ کی تعریف اور آپ کے لئے دعا نکلی، آپ نے ہاتھ روک لیا، فرمایا: جب تک تم اس ذات کی تعریف کر رہی تھیں جو لائق تعریف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، ہم وظیفہ مقرر کرتے رہے، اب ان چاروں لڑکیوں سے کہو کہ وہی پانچویں لڑکی پر خرچ کریں۔

خاتون فرحاں و شاداں فرمان لے کر والی عراق کے پاس پہنچیں، والی عراق نے خط دیکھا تو رونے لگا اور کہتا جاتا کہ اللہ صاحب مکتوب پر رحم فرمائے! عراقی خاتون نے پوچھا کہ کیا خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے؟ والی نے اثبات میں جواب دیا۔ خاتون کی چیخ نکل گئی اور سوچا کہ ساری محنت ضائع ہو گئی، مگر والی عراق نے تسلی دی اور کہا کہ میں اس خط کو رد نہیں کر سکتا اور مقررہ وظائف جاری ہو گئے۔

یہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے، تو جس لڑکی سے گفتگو کرتے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی، حضرت عمرؒ نے بیوی سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ بیوی نے عرض کیا: گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، صرف دال اور پیاز تھی، وہی سب نے کھائی ہے اور منہ میں بو ہے، اس لئے یہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ رہی ہیں، آپ رونے لگے اور صاحبزادیوں سے فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم قسم قسم کی عمدہ غذائیں کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں داخل کیا جائے؟ یہ سُن کر صاحبزادیوں کو بھی رونا آ گیا۔

خدا ترس اور خدا ناترس قیادت میں یہی فرق ہے، جہاں خدا ترسی، عند اللہ جواب دہی کا احساس اور خوف آخرت ہو، وہاں قیادت انسان کو ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے، وہ اسے ایک ذمہ داری تصور کرتا ہے، نہ کہ اعزاز، وہ اسے فکر مند بناتی ہے، نہ کہ

فارغ البال، وہ عیش و نعم کی پروردہ کو مزدور بنا کر رکھ دیتی ہے اور جمالیاتی ذوق کے غلبہ کے بجائے انسان کی شخصیت کو سادگی کا مرقع بناتی ہے، اسے نرم بستر چبھنے لگتا ہے اور ٹھنڈی چھاؤں بے سکون کر دیتی ہے اور جہاں قیادت کی منزل شہرت، نام و نمود، سیم و زر کا حصول، سکون و آرائش اور اگلی سات پشتوں کے لیے روزگار کا انتظام و انصرام ہوتا ہے، وہاں قیادت عیش و عشرت کے نقشے بناتی اور آرزوؤں کا محل تعمیر کرتی ہے، یہاں تک کہ انسان اپنے ماضی کو بالکل ہی بھول جاتا ہے اور رعایا کے دُکھ درد سے اس طرح بے نیاز ہو جاتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص اپنے ماحول اور گرد و پیش سے!!

(۳۱/مارچ/۲۰۰۰ء)

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے......

الیکشن ختم ہوا اور الیکشن کی معرکہ آرائیاں بھی اپنے پایۂ انجام کو پہنچیں، کہیں خوشی کے شادیانے بجے اور کہیں غم کے تازیانے لگے، کوئی جیتا اور کوئی ہارا، کسی نے فتح پائی اور کسی نے شکست کھائی۔ جیت اور ہار، فتح اور شکست زندگی کے ساتھی ہیں، دنیا کو اللہ نے بسایا ہی اس لئے ہے کہ انسان کبھی خوشی کی حلاوت اور مٹھاس پائے اور کبھی غم واندوہ کی تلخیاں چکھے اور یہ ضروری بھی ہے، اگر انسان ہمیشہ فتح منداور ظفریاب ہی ہو، شکست و ہزیمت سے آشنا نہ ہو، تو مشکل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبر ونخوت سے بچا سکے اور اس کا اخلاقی توازن درست رہے، انسان جب دُکھ، شکست اور نامرادی سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے تو فرعون بن جاتا ہے، اسی طرح اگر انسان ہمیشہ نامرادی اور شکست وناکامی ہی سے دو چار رہے تو حوصلہ وہمت کھو دیتا ہے، دناءت اور پستی اس کی فطرت میں داخل ہو جاتی ہے اور دو متقابل قوتوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے جذبۂ مسابقت فوت ہو جاتا ہے اور یہ کسی بھی معاشرہ کے لئے بہت ہی نقصان دہ اور ترقی کے سفر میں رکاوٹ ہے، صرف حضرات انبیاء کی خصوصیت ہے کہ فتح ہو یا شکست اور شادکامی حاصل ہو یا ظاہری ناکامی، ان کے مزاج واخلاق میں کبھی بے اعتدالی پیدا نہیں ہو سکتی، باقی کوئی بھی انسان مسلسل ایک حالت میں تو عدل اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی دولت، کبھی غربت، کبھی جیت اور کبھی ہار، کبھی صحت اور کبھی بیماری، کبھی خوشی اور کبھی غم، کہ انسان کی تربیت کے لئے یہ ایسا ہی ضروری ہے جیسے انسانی جسم کو دو متضاد اثرات کی حامل غذاؤں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ جتنا پانی کا حاجت مند ہے، قریب قریب اسی قدر

آگ کا بھی، شبنم کی ٹھنڈک اس کے لئے جس قدر فرحت بخش ہے، دھوپ کی تمازت اس سے کم ضروری نہیں، خوشی پر کبھی غم کا سایہ نہ پڑے اور رنج و تکلیف کے ساتھ کبھی راحت کی آمیزش نہ ہونے پائے، اس کی جگہ صرف آخرت ہے۔

اسلام نے ہمیں یہ سبق بھی سکھایا ہے کہ جیت اور ہار کے موقع پر ہمارا کیا رویہ ہو؟ اور ہم کس طرح ان واقعات کا سامنا کریں؟ سیاسی مقابلہ آرائی میں بنیادی طور پر تین گروہ ہوتے ہیں: ایک فاتحین کا، دوسرے مفتوحین کا، تیسرے عوام کا، جو لوگوں کو شکست سے دو چار کرتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن کی جیت ہوئی ہو، فاتحین کے لئے رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بنیادی طور پر تین باتیں ہیں: اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقعہ سے فتح یابی کے بعد شکرانہ کی نماز ادا فرمائی، آج کل اسی جگہ پر مسجد فتح بنی ہوئی ہے، جو مدینہ منورہ میں واقع ہے اور زائرین کو وہاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، فتح مکہ کے بعد بھی آپ ﷺ نے نمازِ شکرانہ ادا کی ہے، اولاً مکہ میں داخل ہونے کے بعد حضرت امِ ہانیؓ کے گھر میں، جس کو بعض محدثین نے نماز اشراق شمار کیا ہے اور بعض نے نمازِ شکر، پھر کعبہ میں داخل ہونے کے بعد کعبہ کے اندر، اگر مکمل نماز ادا نہ کی جائے تو کم سے کم سجدۂ شکر ہی ادا کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپ کو کوئی خوش کن بات پیش آتی تو سجدہ میں گر پڑتے اور اللہ کا شکر بجالاتے، **کان اذا اتاہ امر یسربہ او بشربہ خر ساجدا شکرا للہ** (ترمذی: ۱؍۲۸۷، باب ما جاء فی سجدۃ الشکر) مسلمانوں کا اظہارِ مسرّت کا طریقہ یہی ہے، حضرت ابوبکر صدیق ﷜ کو جنگ یمامہ میں فتح ہوئی اور حضرت علی ﷜ نے خوارج کے مقابلہ میں فتح پائی تو یہی سجدۂ شکر ادا فرمایا، (المغنی: ۱؍۳۶۲) حضرت عمرؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ سے بھی سجدہ شکر ادا کرنا ثابت ہے، (شرح مہذب: ۴؍۷۰) خوشی کے اظہار کے لئے جلوس اور ریلی نکالنا، تفاخر آمیز نعرے لگانا، پٹاخے چھوڑنا اور غیر مسلم اقوام کی طرح ایک دوسرے پر گلال پھینکنا، یہ سب اللہ کو ناراض کرنے اور اس کے غضب کو دعوت دینے والی باتیں ہیں۔

فاتحین کے لئے دوسرا اسوہ یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت وہ جتنا پُر اعتماد اور باحوصلہ ہو،

فتح یاب ہونے کے بعد اسی قدر متواضع اور سراپا انکسار، اس کی چال ڈھال سے، اس کے بول سے، اس کے طرز تخاطب سے، اس کی تقریر و خطاب اور تحریر و بیان سے کسر نفسی اور فروتنی جھلکتی ہو، رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے موقع سے جب فاتحانہ حرم اقدس میں داخل ہوئے تو تواضع اور خشیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ سر مبارک مسلسل جھکا ہوا تھا اور جبینِ اقدس بار بار اونٹ کی کوہانوں سے لگ جاتی تھی، نہ نعرۂ افتخار تھا، نہ دعویٰ عز و وقار، نہ گردن اکڑی ہوئی، نہ سینے تنے ہوئے اور نہ سر اٹھے ہوئے، ایک صاحب نے جوش میں کہہ دیا کہ آج کشت وخون کا دن ہے، الیوم یوم الملحمۃ، تو آپ ﷺ نے فوراً ان کی بات کاٹی اور فرمایا کہ آج رحم دلی، مہربانی اور عفوودرگذر کا دن ہے، الیوم یوم المرحمۃ، زبانِ مبارک پر اللہ کی حمد اور تسبیح و تقدیس کے کلمات رواں تھے اور کسی عمل سے اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا اظہار نہیں ہوتا تھا، افسوس کہ آج بھی بہت سے غیر مسلم قائدین کے یہاں یہ کیفیت موجود ہے، یاد آتا ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جب الیکشن ہوا، جس میں جگ جیون رام اندرا جی کی پارٹی سے الگ ہو گئے اور اندرا جی کو شکست فاش ہوئی، الیکشن کی تمام تر معرکہ آرائیوں کے باوجود لکھنؤ کی پریس کانفرنس میں ایک شخص نے اندرا گاندھی پر کچھ رکیک ریمارک کیا، جگ جیون رام حالانکہ اس وقت اندرا جی کے مخالفین کے سرخیل تھے، لیکن انہوں نے اس ریمارک کا بُرا مانا اور کہا کہ اندرا جی ایک باعزت اور قابلِ احترام قائد ہیں اور انہوں نے ملک کی بہت کچھ خدمت کی ہے اور آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اچھے دن دکھائے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا، متکبرانہ نعرے اور تفاخر آمیز بیانات سے اسے ایک لذت سی آنے لگتی ہے، ہم لوگوں کا یہ حال زندگی کے ہر شعبہ میں ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خدا سے بے خوفی کی وجہ سے ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ جب ہم اپنی کسی مہم میں کامیاب ہوں تو اس وقت خاص کر اپنی زبان اور اپنے کلام کو متکبرانہ دعووں سے اور بیانات سے محفوظ رکھیں۔

فاتحین کے لئے رسول اللہ کا تیسرا اسوہ شکست کھانے والوں کے ساتھ فراخ دلی اور سیر چشمی کا ہے، غزوۂ اُحد کے موقع سے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور روئے انور لہو

لہان ہو گیا، لیکن اس کے باوجود زبانِ مبارک پر اپنے دشمنوں کی جانب سے معذرت کے کلمات تھے، کہ یہ مقام نبوت سے نا آشنا ہیں، اس لئے انہوں نے ایسی حرکت کی ہے، فتح مکہ کے موقعہ سے کیسے کیسے جانی دشمن سامنے کھڑے تھے، انہوں نے آپ کو کیسی کیسی تکلیفیں نہ پہنچائیں، کیا آپ کا بائیکاٹ نہیں کیا؟ ایک ایک دانہ کے لئے تڑپایا نہیں؟ بیٹی کو طلاق نہیں دلوائی؟ گلے میں پھندا نہیں ڈالا؟ عین صحن کعبہ میں پشتِ مبارک پر غلاظت نہیں ڈالی گئی؟ قتل کے منصوبے نہیں بنائے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو اجاڑنے کی کیسی کیسی کوششیں نہ کیں؟ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ زبان پر ایک حرفِ ملامت بھی نہیں ہے، نہ طعنہ و تشنیع ہے، نہ اہانت و تحقیر ہے، نہ شماتت ہے اور نہ اظہارِ عداوت، آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم سب آزاد ہو، تم پر کوئی گرفت اور مواخذہ نہیں، **انتم الطلقاء، لا تثریب علیکم الیوم**، عثمان بن طلحہؓ کے پاس کعبۃ اللہ کی کلید تھی، ہجرت سے پہلے ایک بار آپ ﷺ نے کعبہ میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کرنی چاہی تو انہوں نے بہت تمسخر آمیز انداز پر آپ ﷺ کی خواہش رد کر دی۔

آج آپ ﷺ نے انہیں سے کنجی لے کر کعبہ میں نماز ادا فرمائی، متعدد اکابر صحابہؓ اور خود آپ کے اہلِ خاندان چاہتے تھے کہ کعبہ کی کنجی انہیں حوالہ کی جائے، کیوں کہ کلید بردار کعبہ ہونا عربوں میں بہت شرف کی بات سمجھی جاتی تھی، لیکن آپ ﷺ نے کنجی پھر انہیں کو دوبارہ واپس کر دی اور فرمایا کہ آج حسنِ سلوک اور وفا شعاری کا دن ہے، **الیوم بر وفـــاء**، غزوۂ بدر میں اساطینِ کفر اسلام کے مقابلہ میں کھڑے تھے، رؤساءِ قریش قیدی بنائے گئے، ان کی عداوت و دشمنی دوپہر سے زیادہ روشن تھی، لیکن آپ ﷺ نے کرمروت اور رواداری کا معاملہ فرمایا، مہمان کی طرح رکھا اور نئے کپڑے پہنا کر اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ سلوک کافروں اور دینِ حق کے باغیوں کے ساتھ تھا اور آج ہمارا رویہ ایک کلمہ گو کے ساتھ بھی اس سے مختلف ہے، برادرانِ وطن ہمارے اس طور و طریق پر ہنستے ہیں اور ہماری شدت پسندی اور اشتعال انگیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔

مفتوحین یعنی جو لوگ شکست سے دوچار ہوئے، ان کے لئے بھی حیاتِ نبویؐ میں

اسوہ موجود ہے، تکلیف دہ اوقات میں صبر و تحمل، اشتعال سے اجتناب اور توازن واعتدال کو قائم رکھنا شکست سے دوچار ہونے والوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے، اکثر ردِ عمل میں انسان انصاف کی حدوں میں قائم نہیں رہ پاتا اور جس سے اختلاف ہو اس کے بارے میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی بات کہہ جاتا ہے، اس سے خوب اجتناب کی ضرورت ہے، ایسے لوگوں سے اللہ کی مدد روٹھ جاتی ہے اور انسان دنیا اور آخرت دونوں سے محروم ہو جاتا ہے، یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جو کام منفی اساس پر کیا جاتا ہے اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے، جو کام مثبت بنیادوں پر ہوتا ہے اس میں بقا اور ارتقاء ہے، اس لئے ہمیشہ اپنی مہم کو مثبت سمت میں رکھنا چاہئے، مثبت طریقہ پر جو کام کیا جائے، اس کے اوپر اٹھنے میں کچھ وقت لگتا ہے، لیکن اس کی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں اور وہ کام دیرپا ہوتا ہے، جو تحریک منفی مقاصد کے تحت اٹھتی ہے وہ طوفان بن کر چھا جاتی ہے، لیکن طوفان کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور اس طرح ختم ہوتی ہے کہ اس کے نقوش راہ بھی زمین پر باقی نہیں رہتے، اس لئے ہمیشہ مثبت فکر کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔

شکست ہمیں ''خود احتسابی'' کی دعوت دیتی ہے، کہ ہم آپ اپنا احتساب کریں اور پوری دیانت داری اور جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو محسوس کر کے مستقبل کا منصوبہ طے کریں، اگر واقعی دیانت کے ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم حق اور سچائی پر ہیں، تو شکست سے مایوس نہ ہوں، شکست تو اللہ کے پیغمبروں اور اس کے مقبول بندوں کو بھی ہوئی ہے، بلکہ نئے عزم اور نئے حوصلوں کے ساتھ ہم دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں اور اشتعال سے بچتے ہوئے سنجیدہ طریقہ پر دوبارہ متحرک ہو جائیں اور اگر ہم ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایک غلط بات کو اپنی کوششوں کا موضوع بنا رکھا ہے، تو پوری دیانت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے رویہ میں تبدیلی لائیں، کہ غلطی کا اعتراف غلطی پر اصرار سے کہیں بہتر اور دین و دنیا دونوں کی فلاح کا ضامن ہے، جو لوگ حق و راستی پر رہتے ہوئے شکست کھائیں، ان کے لئے بھی صحیح راستہ رجوع الی اللہ ہی ہے، خدا کے سامنے جھکنا، اسی کے سامنے اپنا دردِ دل رکھنا، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا اور

ہر بات کو من جانب اللہ تصور کرنا، یہ اصحابِ ایمان کا طریقہ ہے۔

عام مسلمان جو اپنے حق رائے دہی کے ذریعہ جیت اور ہار کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اب جب کہ معرکہ انتخاب گذر چکا ہے، اختلاف و انتشار کی فضا کو ختم کریں، اخوت اور بھائی چارگی کا ماحول پیدا کریں اور اختلاف کے باوجود اتحاد قائم رکھنے کا سبق سیکھیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی ایسے امیدوار کو ووٹ دیا ہو جو کامیاب ہوا ہے، تو اسے اپنی فتح سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ امیدواروں کی شکست و فتح تو ہوسکتی ہے، ووٹروں کی شکست و فتح نہیں ہوسکتی، اگر آپ نے کسی امیدوار کو دیانت داری کے ساتھ موزوں امیدوار سمجھ کر ووٹ دیا ہے، تو گو وہ شکست کھا جائے، پھر بھی آپ کی فتح ہے، کہ شرعاً آپ جس بات کے مکلف تھے، آپ نے اسے پورا کردیا اور اگر آپ کا ووٹ فتح یاب امیدوار کے حق میں گیا، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، یا آپ نے کوئی مفاد حاصل کرکے ووٹ دیا اور گویا رشوت لے کر مستحق یا غیر مستحق شخص کے حق میں اپنے حق رائے دہی کو استعمال کیا تو امیدوار کے جیتنے کے باوجود آپ نے شکست کھائی ہے اور آپ نے پایا نہیں ہے بلکہ کھویا ہے، کیوں کہ آپ ایک فعل گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس کی کوتاہ کاریوں میں عنداللہ آپ شریک سمجھے جائیں گے، کتنی گھبرا دینے والی ہے یہ بات اور کتنا تشویش انگیز ہے الیکشن کا شرعی پہلو!! ایسے موقع کے لئے شاعر حقیقت ترجمان اکبرالہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
خواہ کیسا ہو وہ صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۱۵؍اکتوبر ۱۹۹۹ء)

قومی یکجہتی ـــــــ کیوں اور کس طرح؟

یوں تو تمام انسانیت کی ابتداء حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے ہوئی ہے اور بنیادی طور پر تمام انسان ایک ہی خاندان اور کنبہ کے افراد ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی سماج کو ایک گلدستہ کی صورت میں وجود بخشا ہے، یہ وحدت میں کثرت کا خوبصورت مظہر ہے، انسان کالے بھی ہیں اور گورے بھی، خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی، ذہین وذکی اور ایسے کہ کائنات ان کے دست تسخیر سے اپنے آپ کو بچانے سے عاجز اور کمزور وناتواں ایسے کہ مریض ومعذور ہوں تو پانی کا ایک گلاس بھی نہ اٹھا سکیں، بعض ایسے تیز مزاج کہ آگ بھی ان کے سامنے پانی پانی ہوجائے اور بعض اتنے نرم خو کہ برف کی ٹھنڈک بھی ان پر نثار ہو، تہذیب وتمدن، زبان اور ذریعۂ اظہار کا فرق سب سے نمایاں، جو ہر سو دو سو کیلو میٹر پر تبدیل ہوتا رہتا ہے، چوں کہ انسان عقل وخرد کی نعمت سے سرفراز ہے، اس لئے ان کے درمیان فکر وعقیدہ کا اختلاف پایا جانا بھی فطری امر ہے، غرض انسان ایک گلدستہ ہے جس میں مختلف رنگ وبو اور ذائقہ کے پھول جمع ہیں۔

اگر کوئی انسان چاہے کہ تمام انسان اسی کے ہم رنگ ہوجائیں، جس طرح وہ سوچتا ہے، اسی طرح سب سوچے، اس کی پسند سب کی پسند ہو اور اس کی ناپسند سب کی ناپسند، تو انسانی سماج مختلف پھولوں کا گلدستہ نہ رہے گا، بلکہ سرسوں کا کھیت بن جائے گا کہ پورا کھیت زرد اور یک رنگ نظر آئے، اسی سوچ اور مزاج کے خلاف کی وجہ سے مختلف انسانی طبقات کے درمیان انتشار وافتراق پیدا ہوتا ہے، سماج میں زندگی گزارنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ سماج کے گلدستہ ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرے یعنی وہ وحدت میں کثرت کو قبول کرتا ہو اور اختلاف کے باوجود اتحاد کا قائل ہو، یہی صورت سماج میں امن و

امان کے برقرار رہنے کی ضامن ہے اور اسی کا نام ''قومی اتحاد'' یا ''قومی یکجہتی'' ہے۔

دُنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، اس کے لئے قومی یکجہتی انتہائی اہم ضرورت ہے، لیکن جو ملک جس قدر کثیر قومی اکائیوں پر مشتمل ہو، قومی اتحاد و یکجہتی اس کے لئے اسی قدر ضروری ہے، ہمارا ملک ہندوستان دُنیا کے ان ملکوں میں ہے جن میں بے شمار مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے قومی یکجہتی نہ صرف اس ملک میں امن و امان اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے، بلکہ ملک کی سلامتی اور اس کا بقاء بھی اس سے متعلق ہے، اس لئے ہمیشہ محب وطن اور مخلص رہنماؤں نے قومی یکجہتی اور اتحاد پر زور دیا ہے۔ کل ہی ۱۹/ نومبر کی تاریخ گزری ہے، ہمارے ملک میں اس دن کو ''قومی یکجہتی'' کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔

یکجہتی اس طرح تو ممکن نہیں کہ تمام انسانیت ہم رنگ ہو جائے، ان میں فکر و نظر، تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کا کوئی فرق باقی نہ رہے، ایسی یکجہتی تو شاید قبرستان کے شہر خموشاں کے سوا کسی زندہ انسانی آبادی کے درمیان ممکن نہ ہو، یکجہتی ''جیو اور جینے دو'' کے اُصول پر ہی پیدا ہوسکتی ہے، اسلام جس کی تمام تعلیمات و احکام کا بنیادی مقصد ہی انسانیت کو امن و سلامتی سے ہمکنار کرنا ہے، اس نے قومی یکجہتی کے لئے ایک پورا نظام قانون عطا کیا ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا ہے۔

اسلام نے مخلوط سماج میں زندگی گزارنے کا جو تصور دیا اس کا پہلا اُصول ''بقاءِ باہم'' ہے، یعنی مختلف لوگوں کو اپنے اپنے مذہب اور تہذیب کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اِکراہ اور دباؤ کی گنجائش نہیں، گو مذہب حق ''اسلام'' ہی ہے اور اللہ کے نزدیک یہی دین مقبول ہے، لیکن دُنیا میں کسی کو کسی مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، '' لا اکراہ فی الدین '' (البقرہ:۲۵٦) جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اسی بنیاد پر آپ ﷺ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان باضابطہ تحریری معاہدہ کرایا اور نام بنام مدینہ کے تمام قبائل کا اس میں ذکر فرمایا، اس دستاویز میں ایک فقرہ اس طرح ہے، ''یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک

گروہ ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔''

کسی قوم کے لئے اس حق کو تسلیم کرنا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، ان کے تمام مذہبی حقوق کا اقرار واعتراف ہے، یہ اس بات کو بھی شامل ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق حاصل ہے، یہ مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ضمانت بھی ہے، مروان بن عبدالملک نے اپنے عہد میں دمشق کی جامع مسجد سے متصل چرچ کی چھوٹی سی زمین کو جامع دمشق میں شامل کر دیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تخت خلافت پر بیٹھے اور عیسائیوں نے استغاثہ کیا، تو آپ نے مسجد کے اس حصہ کے منہدم کرنے کا حکم جاری فرمادیا، لیکن خود عیسائی حضرات نے اس کے عوض دوسری جگہ کا لینا قبول کرلیا، حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے موقعہ سے بعض راہبوں کی خواہش کے باوجود ایک چرچ میں نماز ادا کرنے سے گریز کیا، کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے مسلمان اس جگہ کو زبردستی مسجد بنانا چاہیں۔

اسی طرح نجی زندگی میں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے کی گنجائش بھی مذہبی آزادی میں داخل ہے، اسلامی ملک میں غیر مسلم نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے، کھانے، پینے میں بھی اسلام کا قانونِ حلال وحرام ان پر نافذ نہ ہوگا، شراب مسلمانوں پر حرام ہے، لیکن جن کے مذہب میں اس کی ممانعت نہیں، اس کے لئے شراب کی پابندی نہ ہوگی، خنزیر اور مردار اسلام میں حرام ہے، لیکن غیر مسلم اس کے کھانے اور خرید وفروخت کرنے میں آزاد ہوں گے۔

یہی حال تہذیبی اور لسانی اکائیوں کا ہے، ہر شخص اپنی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے میں آزاد ہوگا، بشرطیکہ اس سے دوسری قوموں کو ایذاء نہ پہنچے، زبان کے بارے میں بھی اسلام بڑا فراخ دل مذہب ہے، اس کی نگاہ میں ہر زبان اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، ہر قوم کی زبان میں اللہ کے پیغمبر آئے ہیں، اس طرح گویا بے شمار زبانیں ہیں، جن کو احکامِ خداوندی کے ترجمان بننے کا شرف حاصل ہے، کسی شخص کو اس کی زبان سے محروم نہیں کیا جاسکتا، فارس کا علاقہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ہاتھ آچکا تھا، اگر

مسلمان جبراً زبان کی تبدیلی کے فلسفہ پر یقین رکھتے، تو یقیناً آج اس خطہ کی زبان عربی ہوتی، لیکن آج تک اس خطہ کی زبان فارسی ہے، کم وبیش یہی بات وسط ایشیائی علاقوں اور ہندوستان کے مغرب کے علاقوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

دوسرا اہم اُصول جس کو اسلام نے سماجی اور سیاسی نظام میں برتا ہے، وہ ''مساوات و برابری'' کا اصول ہے، قرآن نے صرف تقویٰ کو فضیلت کا معیار قرار دیا ہے، ''ان اکرمکم عند اللہ اتقکم'' (الحجرات:۱۳) نسل ونسب، رنگ اور زبان فضیلت و شرافت کا معیار نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں، یہ تصور ذات پات کی بنیاد پر تفریق کی نفی کرتا ہے اور تفریق کی یہی آگ ہے جس نے ہزاروں سال سے ہمارے ملک میں انسانیت کو جھلسا رکھا ہے، اسلام میں خلافت کا تصور سیاسی اعتبار سے تمام انسانوں کے مساوی ہونے پر روشن دلیل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے، تو اس کی بھی پیروی کرو، معلوم ہوا کہ سماج کا ایک معمولی سے معمولی سطح کا آدمی بھی صلاحیت کے ذریعہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ حاصل کرسکتا ہے، اسلام کے امتیازی اوصاف میں سے یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہے، اس میں دولت مند اور غریب، اونچی ذات نیچی ذات، حکمراں اور محکوم کا فرق نہیں، جس طرح رکشہ چلانے والے مزدور کو عدالت میں جواب دہی کرنی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک سربراہِ ملک کو بھی ایوانِ عدل میں اپنے آپ کو ایک معمولی شخص کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، مساوات و برابری کے اس تصور اور عمل کے بغیر مختلف قومی اکائیوں کا ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس اعتماد کا باقی رہنا اور حقیقی معنوں میں قومی اتحاد کا وجود میں آنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف رائے کا پایا جانا اسی قدر یقینی ہے جتنا دن میں سورج کا وجود، اس اختلاف کے باوجود اتحاد کو باقی رکھنے کی صورت اس کے سوا نہیں ہوسکتی کہ ہم لوگوں کو اختلاف رائے کرنے کا، اپنی رائے کے اظہار کا اور احتجاج کا حق دیں،

احتجاج واختلاف کا جائز راستہ کھلا رکھا جائے، تب ہی اس کے ناجائز اور غیر قانونی راستے بند ہو سکتے ہیں، اسلام نے سماجی زندگی میں باہم مل جل کر رہنے کے جو اُصول مقرر کئے ہیں ان میں ایک اہم حق اظہار رائے اور تنقید واحتجاج کا حق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کی سیر چشمی کا حال یہ تھا کہ خود آپ ﷺ کے رفقاء انتظامی اُمور میں بعض اوقات آپ ﷺ سے اختلاف رائے کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، قرآن کی نگاہ میں ''منکر'' پر ٹوکنا ہر انسان کا فطری حق ہے، جس کو ''نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ گویا شرافت کی حدوں میں رہتے ہوئے تنقید واحتجاج کے حق کا اعتراف واعلان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قومی یکجہتی پیدا کرنی ہے، تو اس کے لئے انہیں اُصولوں کو اختیار کرنا ہوگا کہ ہر طبقہ اپنی طرح دوسروں کے لئے بھی اس حق کو تسلیم کرے کہ اسے اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے سماجی تشخصات کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش نہ کرے کہ اس سے گروہ واریت میں اضافہ ہوگا اور فاصلے بڑھتے جائیں گے، ہر قوم کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے، ذات پات، مذہب اور علاقہ کی بنیاد پر تفریق نہ برتی جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا، تو بجا طور پر کچھ لوگ احساسِ محرومی میں مبتلا ہوں گے اور جب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے بارے میں یہ احساس رکھتا ہو کہ اس نے اس کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے تو یہ احساس یقیناً حقیقی اتحاد میں رکاوٹ بنے گا، قومی یکجہتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طبقہ بلکہ ہر شخص کو جائز تنقید کا موقع دیا جائے، جہاں جائز تنقید کا راستہ بند کیا جاتا ہے، وہاں تخریب کی راہیں کھلتی ہیں اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں ان لوگوں کو جو حقیقی معنوں میں محب وطن ہیں، یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوتوا، برہمن واد اور طاقت کے ذریعہ اختلاف کو کچلنے کا اندازِ فکر قومی یکجہتی کے لئے زہر ہلاہل ہے، قومی یکجہتی نفرت کا پتھر پھینک کر حاصل نہیں کی جا سکتی، اس کے لئے محبت اور پیار کے پھول برسانے ہوں گے۔

(۱۸ر نومبر ۱۹۹۸ء)

کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

روزنامہ ''منصف'' (۲۳/ جولائی) ''یو۔این۔آئی'' کے واسطہ سے ایک خبر شائع ہوئی ہے، اس خبر کے مطابق ''اتر پردیش میں الہ آباد کے ایک ایڈیشنل ضلع جج نے درجِ فہرست طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک جج سے جائزہ حاصل کرنے کے بعد اپنے اجلاس کی گنگا کے پانی سے دھلائی کی''، یہ ایک اہم خبر ہے، جس سے ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائی جانے والی ذہنی پستی اور تنگ نظری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، دل میں چبھنے اور ضمیر کو زخمی کرنے والی اتنی اہم خبر کو ذرائع ابلاغ نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور یہ ایک آئی گئی بات ہوگئی، نہ ملکی اور قومی اخبارات نے اس کو اپنے اداریہ کا موضوع بنایا، نہ اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس نے جگہ پایا اور نہ قومی سطح کے سیاسی قائدین نے اس پر اظہارِ خیال کی ضرورت محسوس کی، نہ معلوم یہ بے التفاتی دانستہ ہے یا نادانستہ، کیوں کہ یہ ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے بارے میں اس قدر ''چوکس'' اور ''حاضر دماغ'' ہیں کہ اگر معمولی سی بھی کوئی ایسی خبر آجائے جس سے مسلم سماج کی تصویر بگاڑی جاسکتی ہو، تو وہ میڈیا کے لئے دلچسپ موضوع بحث بن جاتا ہے، انگریزی اور ہندی اخبارات جلی عنوان اور شہ سرخیوں کے ساتھ ایسی خبروں کو شائع کرتے ہیں اور مرچ مصالحہ ڈال کر فرقہ پرست حلقہ کے لئے اس کو لذیذ اور ذائقہ دار بناتے ہیں اور واقعہ کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا ہر مسلمان خاندان اس میں ملوث ہے، حقیقت یہ ہے کہ رائی کو پہاڑ بنانے اور پہاڑ کو رائی میں سمیٹنے کی مثال کوئی شخص دیکھنا چاہے تو صحافت کی ''افسانوی دنیا'' میں دیکھ سکتا ہے!

کسی ملک کی ترقی یہ نہیں ہے کہ وہ کتنے طاقتور اسلحہ رکھتا ہے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد تباہ و برباد کرنے کی کیسی صلاحیت سے مالا مال ہے کہ ہلاکت خیزی و تباہ کاری کی قوت تو درندوں میں انسان سے زیادہ ہے، اگر یہ قابل توصیف بات ہوتی تو لوگ

زلزلہ وطوفان کی تحسین وستائش کرتے اور شیر اور بھیڑیے کا خیر مقدم کرتے، ملک وقوم کی اصل ترقی انسانی اقدار کے اعتبار سے اس کی بلندی وارتقاء میں ہے، وہ سماج قابل تعریف ہے، جو انسانی ضمیر رکھتا ہو، جو محبت سے بھرپور دل رکھتا ہو، جو انسان کے لئے کڑھنا اور دبے کچلے لوگوں کے لئے سسکنا جانتا ہو، جو ہر انسان کو اپنے کنبہ کا ایک حصہ سمجھتا ہو، جو قدر ومنزلت اور نجابت وشرافت کو رنگ ونسل میں، خاندان وقبیلہ میں، زبان وبیان میں اور جغرافیائی وعلاقائی تنگنائیوں میں تلاش نہ کرتا ہو، بلکہ کردار واخلاق کی عظمت پر یقین رکھتا ہو، جو اپنے جیسے انسانوں کے لئے عناد وحقارت کا شعلہ نہ ہو بلکہ محبت و پیار کی شبنم ہو، جو سموم نفرت نہ پھیلاتا ہو، بلکہ محبت کی بادِ نسیم بن کر انسانیت کو عطر بار کرتا ہو، اگر کوئی سماج آدمیت ہی سے خالی ہو جائے، وہ خون اور خون میں فرق کرنے لگے، تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے، ''مہذب انسانی سماج'' کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یوں تو دُنیا میں مختلف قومیں گزری ہیں، جو انسان کی طبقاتی تقسیم پر یقین رکھتی تھیں، ہٹلر کی ''نازی تحریک'' کو ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری جو پیدائشی طور پر کچھ لوگوں کی برتری اور حاکمیت کے استحقاق پر مبنی تھی اور اس نے دنیا میں جو ظلم وفساد برپا کیا، وہ آج بھی ایک ضرب المثل ہے، اس قسم کے تصورات اسلام سے پہلے عربوں، ایرانیوں اور یونانیوں کے یہاں بھی پائے جاتے تھے، لیکن کسی مذہبی اور قومی تعصب کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسانیت کی طبقاتی تقسیم کی جڑیں یہودی اور ہندو قوم میں جتنی گہری ہیں، شاید ہی کہیں انسانوں اور انسانوں کے درمیان تفریق وامتیاز کا اتنا گہرا عقیدہ پایا جاتا ہو، یہودیوں کے یہاں حکومت واقتدار بنی اسرائیل کا پیدائشی حق ہے، ان کے عقیدہ کے مطابق وہ خدا کی نگاہ میں معزز اور محترم ہیں اور خدا کے کنبہ کا درجہ رکھتے ہیں اور باقی پوری انسانیت ان کی نسبت سے کمتر درجہ کی حامل ہے، جن لوگوں نے بائبل کے عہد عتیق اور تالمود کا مطالعہ کیا ہو، ان پر یقیناً یہ حقیقت کھلی کتاب کی طرح ظاہر ہے۔

ہندو مذہب کو انسان کی طبقاتی تقسیم کے باب میں یہودیت پر بھی سبقت حاصل ہے، ہندو مذہب کے مطابق انسان پیدائشی طور پر چار گروہوں میں منقسم ہے: برہمن،

چھتی، ویش اور شودر۔ برہما سے مراد خدا کی ذات ہے، اسی لئے برہمن کا لفظ ہی اس طبقہ کی خدا سے قربت کو بتلاتا ہے، برہمن بنیادی طور پر مذہبی نمائندہ ہوتا ہے، ''وید'' کی تعلیم حاصل کرنا اور نذر و نیاز کا لینا صرف برہمن کا حق ہے، برہمن پیدائشی طور پر مخلوق میں اعلیٰ درجہ کا حامل ہے، جو کچھ اس دنیا میں ہے اصل برہمن کا ہے، جن جرائم پر دوسرے لوگ سزائے موت کے مستحق ہیں، برہمن کا اس جرم میں سر مونڈا جا سکتا ہے، دس سال کا برہمن سو سال کے چھتری کے لئے بھی باپ کا درجہ رکھتا ہے، وہ ہر طبقہ کی عورت سے شادی کر سکتا ہے، کسی دوسرے طبقہ کا آدمی برہمن عورت سے نکاح نہیں کر سکتا، تاہم اگر براہمن کسی شودر عورت سے نکاح کرتا ہے تو گویا اپنے آپ کو نرک (جہنم) کا مستحق بناتا ہے، براہمن خواہ کتنا بھی برا عمل کرے وہ تعظیم و احترام کا مستحق ہے، چھتری کا کام دان دینا، چڑھاوے چڑھانا اور حفاظت و صیانت کا کام انجام دینا ہے، ویش تجارت و زراعت، مویشیوں کی پرورش کا کام کریں گے اور دان دیں گے، یہ سب گویا برہمن کی خدمت کے لئے ہیں۔

لیکن ان میں سب سے بدقسمت طبقہ ''شودروں'' کا ہے، یہ وید کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، برہمن کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے، ان کا سب سے اہم کام پورے اخلاص سے برہمنوں کی خدمت کرنا ہے، برہمن شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے، اگر وہ اپنے سے اونچی ذات پر لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے اور غصہ میں لات مارے، تو پیر کاٹ ڈالا جائے، اگر شودر نے برہمن کو گالی دی، تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اور اگر شودر مدعی ہو کہ وہ برہمن کو تعلیم دے سکتا ہے، تو اس کو کھولتا ہوا تیل پلایا جائے، یہاں تک کہ کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوئے، الو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ وضاحت اور قوت و تاکید کے ساتھ انسانیت کو جو پیغام دیا، وہ دو بنیادی فکر و عقیدہ پر مشتمل ہے: ایک وحدتِ الٰہ، دوسرے وحدتِ انسانیت، انسانی وحدت کا تصور مساوات و برابری کی سب سے بڑی تعلیم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، بلکہ تم میں سے سے زیادہ قابل احترام اللہ کی نگاہ میں وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ پر کاربند ہو'' ان

اکرمکم عند الله اتقکم '' آپ ﷺ نے نسلی امتیاز کی جڑ ہی کاٹ دی اور فرمایا تم سب ایک ہی آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، مٹی کی فطرت میں بچھنا اور آنے جانے والے کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ رکھنا ہے، وہ امیر و غریب، خوبصورت و بد صورت اور حاکم و محکوم کے ساتھ ایک معاملہ روا رکھتی ہے، اس طرح آپ ﷺ نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے تئیں تواضع اور تکریم کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

اسلام نے نہ مذہبی اعتبار سے تفریق و امتیاز کو روا رکھا ہے، نہ قانونی اور سیاسی اعتبار سے، اسلام نے مذہبی تعلیم کو کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور نہ کسی طبقہ پر اس کا دروازہ بند کیا، بلکہ ہر مسلمان پر حصولِ علم کو یکساں طور سے فرض قرار دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (......) نماز اسلام کا رکن اعظم ہے اور نماز کی امامت مسلمانوں کی مذہبی قیادت سے عبارت ہے، رسول اللہ ﷺ ہمیشہ خود امامت فرماتے رہے، آپ ﷺ کے بعد خلفاء اور گورنر امامت کرتے تھے، لیکن اس امامت کے لئے بھی آپ ﷺ نے کسی نسل و رنگ کی قید نہیں رکھی، بلکہ فرمایا کہ جو زیادہ بہتر طور پر قرآن پڑھ سکتا ہے وہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق ہے، پھر وہ جو احکامِ شریعت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اس کے بعد وہ جو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محتاط اور متورع ہو، پھر وہ جس کی عمر زیادہ ہو، خاندان، حسب و نسب اور پیشہ کو کہیں بناءِ استحقاق نہیں بنایا گیا، تمام مسجدیں ہر مسلمان پر کھلی ہیں، پھر جو پہلے آئے وہ اگلی صف میں ہوگا اور جو بعد میں آئے وہ اپنے آنے کی ترتیب سے پیچھے کی صفوں میں، اگر ایک نو مسلم چمار کو قرآن زیادہ یاد ہو وہ امام ہوگا اور ایک قدیم سید مسلمان اس کا مقتدی، جہاں اس نو مسلم کے پاؤں ہوں گے وہاں سے قریب ہی اس سید زادہ کی پیشانی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک ناک کٹا ہوا حبشی بھی تم پر امیر ہو، تو اس کی بھی اطاعت کرو، معلوم ہوا کہ کوئی بھی مسلمان جس پر عام مسلمان اتفاق کرلیں، مسلمانوں کا امیر اور فرماں روا ہو سکتا ہے، حضرت زید بن حارثہؓ ایک غلام تھے اور عربوں میں غلام کی کوئی قیمت نہیں تھی، آپ ﷺ نے ان کو اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ایک ایسی فوج پر امیر بنایا، جس میں اکابر قریش ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے، حضرت عمرؓ فرمایا

کرتے تھے کہ اگر حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ زندہ رہتے تو وہ انہی کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرتے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی پہلو سے بھی اسلام نے کس درجہ مساوات اور برابری کا تصور دیا ہے، آپ ﷺ نے قانون کے اعتبار سے بھی سب کو ایک درجہ میں رکھا، یہ نہیں کہ ایک ہی فعل اسرائیلی کے لئے جائز ہو اور غیر اسرائیلی کے لئے ناجائز، ایک ہی جرم کی سزا عام لوگوں کے لئے قتل ہو تو برہمن کے لئے سر کا مونڈانا، ایک عرب خاتون نے چوری کی اور آپ ﷺ نے قرآن کی ہدایت کے مطابق ان کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر فرمائی، لوگوں نے سفارشیں کیں اور خود آپ ﷺ ہی کے پروردہ محبوب صحابی حضرت اسامہؓ کو ترجمان بنایا، آپ ﷺ اس بات پر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی، تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے، پچھلی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے معمولی لوگوں پر سزائیں جاری کیں اور سماج کے معزز لوگوں کو سزا سے بری کر دیا، غرض اسلام نے ہر سطح پر انسانی مساوات و برابری اور اخوت و بھائی چارگی کا سبق انسانیت کو پڑھایا۔

مسلمان جب اس ملک میں ابر رحمت بن کر داخل ہوئے تو اس ملک کے باشیوں کے لئے ان کے ہاتھ میں سب سے بڑا تحفہ یہی ''انسانی وحدت'' کا پیغام تھا، وہ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، رہتے سہتے اور کھاتے پیتے، نہ کوئی اعلیٰ تھا اور نہ کوئی ادنیٰ، نہ کوئی شودر تھا اور نہ کوئی نجس، نہ خاندانی اعتبار سے کوئی بڑا تھا اور نہ چھوٹا، ان کی عبادتیں مساوات کا مظہر تھیں، وہ ایک برتن میں ایک ساتھ کھایا کرتے تھے، چھوا چھوت کا کوئی تصور نہیں تھا، جو نئے لوگ مسلمان ہوتے وہ ان کے یہاں اتنے ہی معزز ہوتے جتنے پرانے مسلمان، اس مذہبی و سماجی مساوات و برابری نے ہندوستان کے دبے کچلے لوگوں میں حوصلہ و ہمت کے چراغ روشن کئے اور آہستہ آہستہ ہندوستان میں اس طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھنے لگی، بھکتی تحریک اور مختلف تحریکیں جو طبقاتی تقسیم اور مورتی پوجا کے خلاف ہندوستان میں اٹھیں، وہ اس ملک میں خورشیدِ اسلام ہی کے طلوع ہونے کا اثر تھیں۔

منصف مزاج ہندو دانشوروں اور خود ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، نہرو جی لکھتے ہیں: ''اسلامی اخوت و مساوات نے ___ جس پر

مسلمانوں کا ایمان و عمل تھا ــــ ہندوؤں کے ذہنوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اس سے خاص طور پر وہ محروم لوگ زیادہ متاثر ہوئے، جن پر ہندوستانی معاشرہ نے برابری اور انسانی حقوق سے استفادہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا''۔ (ڈسکوری آف انڈیا: ۲۲۵) یہ بات بظاہر عجیب لگتی ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے ہندو سماج کی اصلاح کی کوششیں جاری ہیں، بابائے قوم گاندھی جی، راجہ رام موہن رائے، ڈاکٹر امبیڈکر اور کتنی ہی برگزیدہ ہندو شخصیتوں نے اس کے لئے بے شمار کوششیں کیں، آزادی کے بعد پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی سہولت بھی فراہم کی گئی، لیکن آج بھی صورتِ حال ''ہنوز روزِ اول'' کا مصداق ہے اور ایک ایسا شخص جو انصاف کی کرسی پر متمکن ہے اور مظلوموں کو انصاف کی فراہمی جس کا فریضۂ منصبی ہے، وہ بھی اپنے ہم منصب دوسرے شخص کو محض اس لئے ذلیل و حقیر گردانتا ہے کہ وہ اس کے خیال کے مطابق نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندو قوم میں ذات پات کا مسئلہ محض ایک سماجی اور رواجی مسئلہ نہیں، بلکہ ایک اعتقادی مسئلہ ہے، طبقاتی تقسیم کا تصور ان کے عقیدہ کا جزو ہے، رسم و رواج کی اصلاح نسبتاً آسان ہے اور سماجی برائیوں کو دور کرنا کم دشوار ہے، لیکن جس تصور نے ایمان و عقیدہ کا درجہ حاصل کر لیا ہو اور جس کی جڑیں افکار و تصورات میں پیوست ہوں، ان کو اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا، نہ اعلیٰ تعلیم اس کی اصلاح کر سکتی ہے اور نہ اُونچا سے اُونچا عہدہ، قلب و ضمیر اور فکر و عقیدہ میں تبدیلی کے بغیر کوئی چیز نہیں، جو اس برائی کی اصلاح کر سکے، کاش، مسلمان برادرانِ اسلام تک ایمان و عقیدہ کا یہ قیمتی اور انمول تحفہ پہنچا سکتے!!! اور اس ملک سے محبت اور خیر خواہی رکھنے والے تعصب کا چشمہ اپنی نگاہوں سے اُتار کر اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کی نجات کا راستہ کہاں ہے اور جو نسخۂ کیمیا اس قومی مرض کے لئے مطلوب ہے، وہ کس کے پاس ہے؟ ورنہ اگر اتنی اعلیٰ سطح پر چھوا چھوت کے اس تصور کے ساتھ پائی جانے والی دستوری جمہوریت ہی کا نام انصاف اور مساوات ہے تو بقولِ شخصے: کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

(۷/اگست ۱۹۹۸ء)

بوڑھے اور ہمارا سماج

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں نشو ونما کا ایک تدریجی نظام مقرر کیا ہے کہ ہر چیز جب پیدا ہوتی ہے اور وجود میں آتی ہے تو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ناقص اور ناتمام ہوتی ہے، چاند ایک باریک دائرہ کی صورت میں نکلتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا قالب نور کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، سورج جب مشرق کی طرف اپنے رُخ سے نقاب الٹتا ہے تو اس کی کرنیں ہلکی بھی ہوتی ہیں اور پھیکی بھی بڑا سے بڑا درخت بھی جب زمین کے شکم سے باہر آتا ہے تو ایسے معمولی اور کمزور پودوں کی صورت میں کہ ہوا کا معمولی جھونکا اور پانی کی ہلکی سی لہر بھی اس کے لئے موت کا پیغام بن جاتی ہے، پھر یہی ناقص و ناتمام چیزیں اپنے شباب کو پہنچتی ہیں، اس کی صلاحیتیں جوان ہوتی ہیں اور اس کی طاقت اوجِ کمال پہ پہنچ جاتی ہے لیکن اس کمال کے بعد پھر انحطاط اور زوال شروع ہوتا ہے اور یہ انحطاط اسے موت اور فنا تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے، سورج رات کے پردہ میں چھپ جاتا ہے، چاند چند دنوں کے لئے افق سے غائب ہو جاتا ہے، درخت سوکھ اور مرجھا جاتے ہیں۔

قدرت نے یہی تدریجی نظام انسان کی زندگی میں بھی رکھا ہے، جب وہ ماں کے پیٹ سے اس لمبی چوڑی، ہنگامہ خیز اور پُرشور کائنات میں آتا ہے تو نہایت کمزور اور طاقت وقوت سے محروم بچہ کی صورت میں، نہ خود کھا سکتا ہے، نہ پی سکتا ہے، اگر خدا نے ماں باپ کے دل میں اس کے تئیں انتہاء محبت نہ ڈال دی ہوتی تو اس کی پرورش شاید ممکن نہ ہوتی، پھر بچے بڑھتے ہیں، جسم میں نشو ونما کا عمل جاری رہتا ہے، عقل بیدار ہوتی ہے، شعور جاگتا ہے، اور انسان جوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے، جو ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا، آج اپنی تقریروں سے دلوں کو گرماتا ہے اور شعر وسخن کی بزم میں آراستہ کرتا ہے، جو اپنے پاؤں پر

کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا، آج کودتا اور دوڑتا پھرتا ہے اور طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے، کل جو ایک لقمہ اٹھا کر اپنے منھ میں رکھنے کی طاقت سے بھی محروم تھا، آج اس کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ سے ایک پورے خاندان کا گذر بسر وابستہ ہے اور اللہ نے اس کو ان کے رزق کا ذریعہ بنایا ہے، یہ جوانی کا زمانہ طاقت کے عروج اور صلاحیتوں کے کمال کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں آدمی کے لئے یہ سوچنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ پھر کبھی کمزوری اس پر اپنا سایہ ڈال سکے گی، چلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑائیں گے، بینائی اس کا ساتھ چھوڑ دے گی اور جسم کی ایک ایک صلاحیت دامن وفا چھوڑ کر رخصت ہوجائے گی، لیکن آخر ہوتا وہی ہے جس سے انسان بھاگنا چاہتا ہے، جوانی رخصت ہوتی ہے اور بڑھاپا اپنی پوری شان کے ساتھ سایہ فگن ہوجاتا ہے، اب آنکھوں پر موٹے چشمے ہیں، چہروں پر جھریاں ہیں، ہاتھوں میں عصا ہے، قدموں میں لرزہ ہے، حافظہ اور یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ رکھا ہے، منھ دانت سے خالی ہے اور آواز ایسی ہے کہ بازو کا آدمی بھی بات سمجھ نہیں پاتا ہے، اس منزل کے بعد قبر ہی کی منزل ہے، انسان بچپن میں بھی محتاج اور عجز و ناطاقتی کا نمونہ ہوتا ہے اور بڑھاپے میں بھی، لیکن بڑھاپے میں یقیناً مجبوری کا احساس زیادہ ستاتا ہوگا، جوانی کے ایک ایک قصے یاد آتے ہوں گے اور اشکِ افسوس سے داڑھی تر ہوتی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے کا زمانہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ قابلِ رحم اور لائقِ ترس ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے بوڑھوں کی خصوصی رعایت اور ان کے احترام و توقیر کا حکم دیا ہے، مغربی دنیا میں خاندانی نظام کے بکھر جانے کی وجہ سے بوڑھے اور ضعیف العمر لوگوں کے مسائل نے بڑی نازک صورتِ حال اختیار کرلی ہے، اسی لئے اب عالمی سطح پر اس مسئلہ کو محسوس کیا جارہا ہے، اقوام متحدہ کی طرف سے یکم اکتوبر کو ''بوڑھوں کے دن'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، لیکن اسے کافی نہ سمجھتے ہوئے ۱۹۹۹ء کے پورے سال کو ''بوڑھوں کا بین الاقوامی سال'' قرار دیا گیا ہے، ایک اندازہ کے مطابق اس وقت دنیا میں بوڑھے اور ضعیف لوگوں کی تعداد چالیس کروڑ کے قریب ہے اور توقع ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یہ تعداد ساٹھ کروڑ سے بھی تجاوز کرجائے گی، ہندوستان میں اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ

سن رسیدہ لوگوں کی تعداد چھ کروڑ سے بھی زیادہ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو برس بعد یہ تعداد سات کروڑ انسٹھ لاکھ ہو جائے گی، بوڑھوں کی تعداد میں آزادی کے بعد سے ایک سو ستر فیصد اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ وسائل علاج میں بہتری بھی ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے شرح پیدائش میں کمی بھی۔

آج بوڑھے اور ضعیف العمر افراد جن مشکلات سے دوچار ہیں، وہ دراصل مغربی نظامِ معاشرت کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان ہی سے مشرق میں بھی یہ سماجی دشواریاں برآمد ہوئی ہیں، مشرق پر ہمیشہ سے مذہبیت کا غلبہ رہا ہے اور دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس میں والدین اور بزرگوں کی خدمت اور ان کے احترام وتوقیر کا سبق نہ پڑھا گیا ہو، اس لئے بزرگوں کی خدمت کا جذبہ اور ان کو بوجھ کے بجائے اپنے لئے رحمتِ خداوندی تصور کرنا مشرق کے مزاج میں رہا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ تم لوگوں کو ضعفاء اور کمزوروں ہی کی وجہ سے رزق دیجاتی ہے، ''اِنَّكُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ''، یہ بڑی اہم بات ہے، آدمی ایسے بوڑھے اور معذور لوگوں کو اسی لئے تو بوجھ سمجھتا ہے کہ وہ صرف کھاتے ہیں، کچھ لاتے نہیں ہیں، ان کے پاس کھانے والے ہاتھ ہیں کمانے والے ہاتھ نہیں، آپ ﷺ نے اس تصور ہی کی جڑ کاٹ دیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ تم ان کو رزق فراہم کرتے ہو، بلکہ ان کی وجہ سے اللہ تم کو رزق عطا فرماتے ہیں، گویا وہ تمہارے محسن ہیں، نہ کہ تم ان کے اور وہ تم کو کھلاتے ہیں نہ کہ تم ان کو، اگر یہ بات دل میں اتر جائے تو لوگ ایسے بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو خدا کی بہت بڑی نعمت تصور کریں اور سایۂ رحمت سمجھیں۔

مغربی سماج کی بنیاد مادیت پر ہے اور مادیت پرستی ہمیشہ خود غرضی کو جنم دیتی ہے، اسی لئے خود غرضی مغربی معاشرہ کا ایک اہم اور بنیادی عنصر ہے، طلاق کی کثرت ان ممالک میں کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب میاں بیوی کا دل ایک دوسرے سے بھر گیا تو اب محبت کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہی، زنا کی کثرت کیوں ہے؟ اسی لئے کہ مرد و عورت کا تعلق محبت کے بجائے وقتی اغراض اور ہوس پر مبنی ہے، سود نے کاروبار میں غلبہ

کیوں پایا ہے؟ اسی لئے کہ سرمایہ دار کو غریبوں کی پریشان حالی سے کوئی غرض نہیں، اس کو صرف اپنا بے خطر سود عزیز ہے، منشیات کی وباء کیوں عام ہے؟ اسی لئے کہ خود تو دو لمحوں کا سکون حاصل ہو جائے، چاہے یہ عیاشی اس کے متعلقین کے لئے کسی قدر بھی سامانِ مصیبت ثابت ہو، غرض ہر شعبہ زندگی کی روح یہی ہے، ایسے سماج میں اگر بوڑھے گھر سے نکال دیئے جائیں، ان کو ہاسٹل میں رکھا جائے، جہاں اپنے بچوں کو دیکھنے کے لئے دل تڑپتا ہو اور نگاہیں ترستی ہوں اور گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کے لئے کرسمس کا انتظار کرنا پڑتا ہو، تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے، مغربی تہذیب کی بادِ سموم کو مشرق کے لوگوں نے بادِ نسیم سمجھا اور ایک نعمتِ عظمیٰ کی طرح ان کا استقبال کیا، تو جو بگاڑ اس نے اپنی جگہ پیدا کیا ہے، یہاں بھی ان کا ظہور میں آنا چنداں عجیب نہیں، چنانچہ اب ہندوستان میں بھی ایسے لوگوں کے لئے ہاسٹل بنے ہیں اور خود ہمارے شہر حیدرآباد کے مضافات میں اس طرح کے ہاسٹل بن چکے ہیں۔

اسلام میں بوڑھوں کے لیے بڑی رعایت بھی ہے اور قدر و منزلت بھی، قدم قدم پر ان کے لئے احکام میں سہولتیں برتی گئی ہیں، نماز میں قیام یعنی کھڑا ہونا فرض ہے، کھڑی ہوئی حالت میں جھک کر رکوع کرنا اور بیٹھی ہوئی حالت میں سجدہ کرنا بھی فرض ہے۔

لیکن جو لوگ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکیں، وہ بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں اور اشارہ سے بھی رکوع و سجدہ کیا جا سکتا ہے، ایسے ضعیف اور سن رسیدہ لوگوں کے لئے گنجائش ہے کہ روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ ادا کریں، بڑھاپے کی وجہ سے سفر کی قدرت نہ ہو تو کسی اور شخص سے حج بدل کرانے کی گنجائش ہے، فریضۂ جہاد ایسے شخص سے معاف ہے۔

ایسے لوگوں کی کفالت شرعاً واجب ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہو تو گو ان میں کمانے اور کسبِ معاش کرنے کی صلاحیت ہو پھر بھی ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے، دوسرے اقارب کا حکم ذرا مختلف ہے، اگر کوئی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کسب معاش کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ لاولد ہو تو قریب

ترین رشتہ دار پر اس کی ضروریات پوری کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر دوسروں پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ (دیکھئے ردالمحتار: ۵/۵۵۔۳۵۲ ودیگر کتب فقہ)

بڑھاپے کی نفسیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس عمر میں انسان چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ساتھ عزت وتوقیر کا معاملہ کریں، اس کو سماج میں بہتر مقام دیا جائے آپ ﷺ نے اس کا بھی پاس ولحاظ فرمایا ہے، ایک سن رسیدہ شخص آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے، لوگوں نے جگہ دینے میں دیر کی، تو آپ ﷺ نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ جو شخص چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، **لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یؤقر کبیرنا** (ترمذی، باب ماجاء فی رحمة الصبیان) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جو بڑوں کا مقام نہ پہنچانے وہ ہم میں سے نہیں، (حوالہ سابق) انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اس کی عمر کی رعایت کرتے ہوئے تعظیم کرے گا تو جب وہ نوجوان اس عمر کو پہنچے گا تو اللہ اس کے لئے بھی ویسا ہی تعظیم کرنے والا مہیا کردیں گے۔ **ما اکرم شاب شیخا لسنه الاقیض الله له من یکرمه عند سنه۔**

(ترمذی، باب ماجاء فی اجلال الکبیر)

بزرگوں کی تعظیم اور اکرام کے عمومی احکام تو آپ ﷺ نے دیئے ہی مختلف خصوصی مواقع پر اس احترام کو برتنے کا بھی حکم دیا، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ جب کئی لوگ ہوں اور ان کو اپنی بات پیش کرنی ہو تو بڑے کو گفتگو اور نمائندگی کا موقع دینا چاہئے۔ "**کبر الکبیر**" (مسلم: ۲/۵۵) اسی طرح اگر دو اشخاص علم، قرأت اور درع وتقویٰ کے اعتبار سے برابر ہوں تو جوان میں عمر دراز ہو اس کو حق امامت میں اولیت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دو رفقاء کو رخصت کرتے ہوئے اس کی نصیحت فرمائی، **ولیؤمکما اکبرکما سنا** (بخاری ومسلم) اسی طرح فقہاء لکھتے ہیں کہ سلام کرنے میں بھی چاہئے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرنے میں سبقت کرے۔ (ہندیہ: ۵/۳۲۵)

ادب واحترام کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں، بلکہ مواقع اور حالات کے لحاظ

سے تکریم واحترام مطلوب ہے؛ کوئی بوڑھا شخص جارہا ہو، بوجھل سامان اس کے ہاتھ میں ہو، آپ نوجوان ہیں، آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ ان کا تھیلا اپنے کاندھوں پر اٹھالیں اور منزل تک پہنچادیں، آپ بس یا ٹرین میں سفر کررہے ہوں، آپ کو سیٹ مل چکی ہو، لیکن ایک بوڑھا، ضعیف شخص کھڑا ہوا ہے، ایسے موقع پر احترام یہ ہے کہ آپ خود اٹھ کر ان کو جگہ دے دیں، اگر آپ ان کو نہیں پہچانتے تو نانا، چچا کہہ کر ان کو مخاطب کریں، غرض، موقع ومحل کے اعتبار سے ان کی خدمت اور توقیر کو ملحوظ رکھیں اور رسول اللہ کی وہ حدیث آپ کے سامنے ہو کہ اگر آج آپ کسی بوڑھے شخص کا پاس ولحاظ کریں گے تو کل جب آپ عمر کی اس منزل کو پہنچیں گے تو دوسرے یہی برتاؤ آپ کے ساتھ کریں گے اور اگر آج آپ نے کسی بوڑھے ضعیف شخص کا مذاق اڑایا، اس کا تمسخر کیا، بے احترامی اور بے توقیری کی، مدد اور تعاون کا ہاتھ نہیں بڑھایا، تو کل یہی سلوک آپ کے ساتھ کیا جائے گا، کہ یہ ''اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کا معاملہ ہے!

(۲۱/مئی/۱۹۹۹ء)

جرائم ـــــ مرض اور علاج

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں دو چیزیں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں: ایک گرانی اور دوسرے جرائم، حد یہ ہے کہ جو لوگ نفرت کی آگ لگانے اور شعلہ بھڑکانے میں قیادت کے منصب پر فائز ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ان کا خصوصی سایۂ عاطفت حاصل ہے، ان کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے، چنانچہ بی، جے، پی قائد اور ملک کے وزیر داخلہ نے پچھلے دنوں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان پر سخت تشویش ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ جبری عصمت ریزی کے مجرم کو پھانسی کی سزا دی جانی چاہئے، اسکولوں اور مخلوط تعلیم گاہوں میں لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پس منظر میں دہلی کی بے، جے، پی گورنمنٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسکرٹ کے بجائے یونیفارم میں شرٹ، شلوار اور دوپٹہ کو لازم قرار دیا جانا چاہئے، دراصل گزشتہ چند سالوں سے ملک اور ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جرائم کے اعداد و شمار کی جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں، اس نے ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کس طرح جرائم کی روک تھام کی جائے؟ اور ان حضرات نے اس روک تھام کے لئے جن تدابیر کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل اسلام کے تصورِ جرم و سزا اور طریقۂ اصلاح کا خاموش اعتراف ہے!

پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے، وہ نہایت جرائم پیشہ سماج تھا، چوری، ڈاکہ زنی، قتل ناحق، دختر کشی، اخلاقی اور سماجی برائیاں، کون سے جرائم تھے جو وہاں بکثرت نہ ہوتے تھے؟ شراب جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، وہ لوگوں کے گھٹی میں پڑی تھی، زمانۂ جاہلیت میں شراب کے قریب سو نام ملتے ہیں، جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کم سے کم سو قسم کی شراب اس زمانہ میں پائی جاتی تھی، قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کا حال یہ تھا کہ لوگ قافلہ کے بغیر تنہا

ایک دو آدمی سفر کے لئے نہیں نکلتے تھے کہ اس کے بغیر بہ سلامت واپس آنے کی امید ہی نہیں رہتی تھی، بدکاری کا حال یہ تھا کہ لوگ اس بات کو بھی درست سمجھتے تھے کہ اچھی نسل حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پاس بھیجا جائے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک عورت سے کئی مرد ہم آغوش ہوتے اور جب بچہ ہوتا تو قیافہ شناس سے نسب کی شناخت کرواتے، اس کو ''نکاح رہط'' کہا جاتا تھا، (بخاری: ۲/۷۶۹) بے حیائی اور فحاشی اس عروج پر تھی کہ لوگ اپنی بدکرداریوں کو لکھ کر غلافِ کعبہ سے آویزاں کر دیتے تھے اور بے تکلف اپنے اشعار میں اس کا ذکر کرتے تھے، جنگ وجدال تو گویا ان کی طبیعتِ ثانیہ تھی اور معمولی واقعات پر مدتوں بلکہ نسلوں معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے جرم وگناہ کے اس جنگل کو صدق وصفا اور محبت ووفا کی بستی بنادیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے: اول دلوں کا تزکیہ اور لوگوں کی فکر اور سوچ میں انقلاب، دوسرے ان اسباب ومحرکات کا سدباب جو جرم میں معاون ہوتے ہیں، تیسرے سنگین جرائم پر سخت سزائیں، یہی طریق کار تھا جس نے جرائم کے خوگر عرب سماج کی حالت بدلی اور انسانیت کے قاتلوں کو انسانیت کا محافظ اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ دلوں کی دنیا میں انقلاب لایا جائے، دل میں خدا کا ایسا خوف بٹھایا جائے اور آخرت کی جواب دہی کا ایسا احساس جاگزیں کیا جائے کہ انسان جیتے جی موت کے بعد کی زندگی کو دیکھنے لگے، آخرت سے پہلے ہی آخرت اس کے سامنے آجائے، وہ محسوس کرلے کہ گویا وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، یہی انقلاب تھا جس کے نتیجہ میں صحابہ معمولی معمولی گناہوں پر تڑپ اٹھتے تھے اور بے چین ہوجاتے تھے۔

کتبِ احادیث میں ایک صحابی حضرت ماعز اسلمیؓ اور ایک صحابیہ حضرت غامدیہؓ کا ذکر آتا ہے، از راہِ بشریت ان سے برائی کا صدور ہوگیا، ان کی غلطی کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ اس پر کسی زبان نے ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف بارگاہِ نبوی ﷺ میں دعویٰ کیا، لیکن احساسِ گناہ نے ان کے زندہ اور صاحبِ ایمان ضمیر کو ایسا تڑپا دیا کہ از خود دربارِ نبوی ﷺ میں

حاضر ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم کی سزا نہایت ہی سخت اور عبرت انگیز ہے، اعتراف جرم فرمایا، یہ احساس اتنا شدید تھا کہ یہ بھی نہیں فرمایا کہ مجھ سے فلاں برائی ہوئی ہے بلکہ عرض کیا :''انی ھلکت یا رسول اللہ !''،''اللہ کے رسول! میں تو لٹ گیا، میں ہلاک و برباد ہو گیا''، گویا کسی گناہ کے صدور کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی ہلاکت اور بربادی کی بات سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے بار بار چہرہ پھیرا اور ایسا عنوان اختیار فرمایا کہ ان کو اپنے اعتراف کی تعبیر و توجیہ اور انکار کا موقع میسر آ جائے، لیکن وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ مجھے پاک فرما دیجئے، یہاں تک کہ ان پر شرعی حد نافذ فرمائی، یہی وجہ تھی کہ پورے عہد نبوت میں ایسے جرائم جن پر حد شرعی مقرر ہے، کے صرف چھ سات واقعات ملتے ہیں۔

انسانی ضمیر کو بیدار کرنے اور جرم کی شناعت کو ذہن میں بیٹھانے کے لئے آپ ﷺ لوگوں کی نفسیات کے مطابق ان کی تفہیم فرمایا کرتے تھے، ایک صاحب نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اور گناہوں سے تو باز آ سکتے ہیں، لیکن زنا سے باز نہیں آ سکتے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری ماں سے بدکاری کرے تو کیا تم اس کو پسند کرو گے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، آپ ﷺ اسی طرح بہن، بیوی، بیٹی کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور وہ کہتے گئے کہ میں ایسا بالکل پسند نہیں کروں گا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جس عورت کے ساتھ بدکاری کرو گے وہ بھی تو کسی کی ماں، بیوی، بہن یا بیٹی ہوگی، ان کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ تائب ہو گئے، ایک دفعہ فرمایا کہ جب کسی اجنبی عورت پر نگاہ پڑ جائے اور طبیعت کا میلان ہو جائے تو اپنے گھر جاؤ، اس لئے کہ تمہاری بیوی بھی تمہاری خواہش کی تکمیل کا وہی سامان رکھتی ہے جو وہ عورت۔

عام طور پر مجرمانہ واقعات مال و زر کے حصول کے لئے پیش آتے ہیں، مال کی بے وقعتی اور دنیا کی بے ثباتی آپ ﷺ نے لوگوں کے ذہن میں اس درجہ بٹھا دی تھی کہ وہ دوسروں کا مال لینے سے خوب اجتناب کرتے تھے، جب کبھی آپ ﷺ ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں آسائش اور آرائش کے اسباب نظر آتے اور عیش و مستی کا سروسامان ہوتا، تو فرماتے کہ عیش تو آخرت ہی کا عیش ہے، جو بے پناہ اور لافانی ہے''لا عیش الا عیش الآخرۃ ''۔

اس طرح آپ ﷺ اپنے رفقاء کو تعلیم دیتے کہ جب اسبابِ دنیا پر دل ریجھنے اور طبیعت مچلنے لگے تو آخرت کے سامانِ عیش کو یاد کرلیں، اس سے نفس کی حرص وطمع کا علاج ہو جائے گا۔

ایک صاحب کا مقدمہ خدمتِ اقدس ﷺ میں آیا، گواہان نہیں تھے، اس لئے فریقین کا بیان سن کر آپؐ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہو کر تمہارے حق میں فیصلہ کر دیا ہو، حالاں کہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہو، تو اگر ایسا ہو، تو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے، آپ ﷺ کی یہ بات سنی تھی کہ وہ صاحب زمین سے دستبردار ہو گئے اور دوسرے فریق نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، بالآخر آپ ﷺ نے وہ زمین دونوں میں نصف نصف تقسیم فرمائی، اس لئے جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر اور سوچ میں انقلاب نہ آئے، سماج کو جرائم سے پاک کرنا ممکن نہیں۔

دوسرے آپ ﷺ نے ان راستوں کو بند کیا جو آدمی کو گناہ تک لے جاتے ہیں، مثلاً اسلام میں زنا حرام ہے، تو شریعت نے اس جرم کو روکنے کے لئے ممکنہ تدبیریں بھی اختیار کی ہیں پردہ کا نظام قائم کیا گیا، غیر محرم خواتین کے ساتھ تنہائی کو منع فرمایا گیا، مخلوط تعلیم اور عبادت کی ممانعت کی گئی، شراب اور نشہ جو ایسی برائیوں کا سب سے بڑا محرک ہے، اس کو سنگین جرم قرار دیا گیا، نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی، نکاح میں تاخیر اور تجرد کی زندگی کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا، فحش لٹریچر اور پوسٹرس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، غرض وہ تمام راہیں بند کر دی گئیں جو انسان کو اس گناہ تک لے جاتی ہوں، اس کے ساتھ جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو نہ جرم سے بچنا لوگوں کو دشوار ہوا اور نہ جرم سے روکنے کے لئے کوئی مہم جوئی کرنی پڑی۔

یہی حال شراب کا ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف شراب پینے کو حرام قرار دیا بلکہ شراب کی خرید وفروخت اور اس کی صنعت، نیز اس کے حمل ونقل کو بھی، اس طرح شراب کا حاصل کرنا ہی کارِ دشوار ہو گیا، اگر ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے تو جو لوگ منشیات کا رجحان رکھتے ہیں، پہلے مجبوراً منشیات سے باز آئیں گے اور پھر یہی ان کی عادت ہو جائے گی۔

جرم کو روکنے کے لئے تیسرا طریقہ قانون کا ہے، بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ

آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور نصح و ہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر دستک دیں، لیکن قانون کی تلوار کے سوا کوئی چیز ان کو سرخمیدہ نہیں کر پاتی، ایسے لوگوں کے لئے سخت قانون بھی ایک ضرورت ہے، اس وقت ایک رجحان یہ پیدا ہوگیا ہے کہ مجرم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رحم دلی اور عفو درگزر سے کام لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ثبوتِ جرم کے قانون کو سخت اور سزا کے قانون کو ہلکا بنایا جائے، گویا مجرم کو دوہرا فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام کا تصورِ جرم وسزا یہ ہے کہ ثبوت جرم کے لئے تو مناسب شواہد کا فراہم ہونا ضروری ہے، تاکہ بے قصور قصوروار نہ ٹھہرے اور کسی کو جرمِ بے گناہی کی سزا ملنے نہ پائے، لیکن جب جرم ثابت ہوجائے تو سزا عبرتناک ہو اور سزا کے نفاذ میں نرم روی اختیار نہ کی جائے، الا یہ کہ جرم کا تعلق کسی خاص انسان کے حق سے ہو اور وہ خود مجرم کو بخوشی معاف کردے، سزاؤں کے سخت ہونے کا فائدہ ماحول کی تطہیر اور عبرت انگیزی ہے، سزائیں اگر سخت نہ ہوں، تو اس سے مجرم کوشہ ملتی ہے اور جرائم پسند طبیعتوں کا حوصلہ بڑھتا ہے، آج کل بڑے بڑے جرائم پر چند ہزار کے جرمانے عائد کئے جاتے ہیں، چند ماہ یا سال سزائے قید ہوتی ہے، یہ جرائم کو روکنے اور مجرمین کے حوصلے پست کرنے کے لئے بالکل ناکافی اور غیر تشفی بخش ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجرم سزا پانے کے بعد جرم سے بچنے کے بجائے اور بھی مہارت کے ساتھ جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس اسٹیشنوں میں ایک مجرم پر بیسیوں بار مقدمات دائر ہوتے ہیں اور وہ تھانہ اور جیل کو''مہمان خانہ'' باور کرنے لگتا ہے۔

سزاؤں کے نفاذ میں سختی کی وجہ سے ردعمل کے طور پر پیدا ہونے والے جرائم کا سد باب ہوتا ہے، کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی ہوئی ہو اور مجرم کو کما حقہ سزا مل جائے، تو مظلوم کی تشفی ہوجاتی ہے اور آتش انتقام بجھ جاتی ہے، اگر اسے یہ احساس ہو کہ ان کے مجرم کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور اسے اس کے جرم کی نسبت سے سزا نہیں مل پائی تو اندر ہی اندر شعلۂ انتقام بھڑکتا اور موقع کی تاک میں رہتا ہے اور جب بھی کوئی موقعہ ہاتھ آجائے وہ جوابی وار کئے بغیر نہیں رہتا، اس طرح سماج میں جرائم کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال جڑ پکڑتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قصاص یعنی مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنے میں

تمہارے لئے زندگی اور حیات مضمر ہے" ولکم فی القصاص حیوٰۃ "۔ (البقرۃ: ۱۷۹)

یہ حقیقت تجربات کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی اور مہر امروز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اگر انسان کو جرائم سے پاک، محفوظ اور پرسکون سماج مطلوب ہو، تو اسے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا اور اسی سماج اور سماج کے طریقۂ اصلاح کو اپنے لئے اسوہ و نمونہ بنانا پڑے گا، جسے صحراءِ عرب کے بدوؤں پر پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ نے اختیار کیا تھا، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ لوگوں کے مردہ ضمیر کو زندہ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی جارہی ہے، حکومت کی انتظامی مشنری جس کی تربیت اور ذہن سازی سرکار کا فریضہ ہے، وہ سرتک کرپشن میں ڈوبی ہوئی ہے اور ظلم وجور اور بداخلاقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، جرائم کے اسباب وعوامل پر تو کیا روک لگے گی، ایسے راستے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جارہے ہیں جو نوجوانوں کو جرم پر اکسائیں اور تشدد کے طریقے بتائیں، بد اخلاقی سکھانے اور مجرم بنانے کے لئے فلمیں ہی کیا کم تھیں کہ ٹی وی کا سیل رواں بھی گھر گھر داخل ہوا، پھر اسٹار ٹی وی کی لعنت آئی جو لوگوں کو دُنیا کے کونے کونے میں پائے جانے والے مجرمانہ طریقے اور حیا سوزی کے نت نئے انداز سے روشناس کراتی ہے، سنا ہے کہ انٹرنیٹ کا جادو اور اس کا مفسدانہ استعمال ان فتنوں سے بھی ماسوا ہے، پرنٹ میڈیا میں جو اخلاق سوز مواد آرہا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، اب تو جرائم کی زندہ کہانیاں بھی چھپ رہی ہیں اور منہ مانگے دام بک رہی ہیں، تاکہ لوگ جرائم و بداخلاقی کے نت نئے انداز سیکھ لیں اور حسب "توفیق" ان کا تجربہ کریں۔

تو کیا جرائم کی اتنی اثر انگیز اور وسیع الاثر تعلیم، نیز ان کے لئے ممکنہ اسباب و وسائل کی فراہمی کے باوجود پرامن اور جرائم سے محفوظ سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے اور کیا رات کی تہ در تہ تاریکی میں سورج کی کرنیں ہاتھ آسکتی ہیں؟؟

(۲۱/اگست ۱۹۹۸ء)

گناہ جو کبھی معاف نہیں ہوگا

اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک اور کفر ہے، اس کی سزا ہمیشہ کے لئے دوزخ ہے، جو شخص کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جائے، اس پر جنت کے دروازے بند ہیں، اور ہمیشہ کے لئے دوزخ آتشیں آغوش اس کی رفیق رہے گی، کفر کے بعد ایک ہی عمل ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوتا رہے گا، اور اللہ کی لعنت برستی رہے گی، کتنا گھبرا دینے اور تڑپا دینے والا ہے یہ ارشاد ربانی:

" وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ، خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا" (النساء:۹۳)

جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کرے اس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہو، اور اللہ نے اس کے لئے بھیانک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کتنی لرزہ براندام کر دینے والی ہے یہ آیت! ــــــ لیکن اس شخص کے لئے جس کے دل میں خوفِ خداوندی کا کوئی گوشہ موجود ہو، جس کی آنکھ کبھی کبھی سہی، اللہ کے خوف سے نم ہونا جانتی ہو، جس کا دل آخرت کے تصور سے مولول لحہ دو لحہ سہی لرزنے سے آشنا ہو، جو آخرت کے وسعتوں پر یقین رکھتا ہو، جسے جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی ہولناکیوں پر ایمان ہو، اور جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہو، جن سینوں میں دل کے بجائے پتھر کی سل رکھی ہوئی ہو اور جن قلوب میں محبت کی شبنم جگہ پانے کی بجائے نفرت اور ظلم و جور کی بھٹیاں سلگتی ہوں ان کے بارے میں کیوں کر سوچا جا سکتا ہے، کہ خالقِ کائنات کا یہ ارشاد

بھی ان کو تڑپا سکے گا؟ خدا اور رسول کی بات بھی ان کے دلوں پر دستک دے سکے گی؟؟؟

آہ! کس قلم سے لکھا جائے اور کس زبان سے بولا جائے کہ ہمارے شہر میں ابھی چند دنوں قبل ایک مسلمان کا بے دردانہ قتل ہوا ہے، کن کے ہاتھوں؟ کیا کسی غیر مسلم کے ہاتھ؟ کیا کسی دشمن اسلام کے ذریعہ؟؟ نہیں، حیرت کے کانوں سے سنئے، کہ ایک کلمہ گو نے دوسرے کلمہ گو کو ناحق قتل کیا ہے، ایک مسلمان کی تشنہ تلوار نے ایک مسلمان ہی کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی ہے، سستے داموں خدا کا غضب خرید کیا ہے، اپنے گلے کو لعنتِ خداوندی کے طوق سے آراستہ کیا ہے، اور ابدی دوزخ حاصل کی ہے، اس بے حسی پر آنکھیں جس قدر آنسوں بہائیں، دل جتنا بھی تڑپے اور روئے کم ہے۔ ہائے، یہ اس امت کا حال ہے جس کو آخر آخر دم تک اس کے نبی ﷺ نے مسلمان کے خون کی حرمت بتائی تھی، اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو سے ہاتھ رنگنے کو منع فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص شرک کی حالت میں مرے یا کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے، (ابوداؤد: ۴۲۷۰) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کو قتل کیا اللہ تعالیٰ نہ اس کی کوئی فرض نماز قبول فرمائیں گے اور نہ نفل، **لم یقبل اللہ منہ صرفا و لا عدلا**، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۲۷۰) اور کیوں نہ ہو کہ مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے ختم ہو جانے سے بہتر ہے۔ **قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا** (نسائی: حدیث: ۳۹۹) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمام اہلِ زمین اور اہلِ آسمان بھی ایک مسلمان کی موت میں شریک ہوں، تو اللہ ان سب کو جہنم میں اوندھے منہ ڈال دے گا، (ترمذی: حدیث نمبر: ۱۳۹۸) اس سے اندازہ کیجئے کہ مومن کے خون کی کیا حرمت اور عظمت ہے؟ اور کسی مسلمان کا جان لینا کیسی لعنت اور غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے؟ اس لئے حضور نے فرمایا کہ مومن برابر دین کے معاملہ میں وسعت و گنجائش میں رہتا ہے، جب تک کہ کسی خون حرام کا مرتکب نہ ہو۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

جیسے قتل کرنا گناہ ہے، اسی طرح قتل میں تعاون بھی گناہ ہے، بلکہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قتل پر اکسایا ہو، یا دوسرے کو قتل پر استعمال کیا ہو، تو اس کا گناہ اصل قاتل سے بھی بڑھ کر ہے، ایک بار آپ ﷺ سے قاتل اور قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ جہنم کے ستر حصے کئے جائیں گے جس میں انہتر (۶۹) حصہ قتل کا حکم دینے والے کے لئے ہوگا اور ایک حصہ خود اس قاتل کے لئے، اور یہ ایک حصہ بھی اس کے لئے بہت کافی ہوگا۔ وللقاتل جزء و حسبه

(مسند احمد، حدیث: ۲۲۵۵۷، عن مرثد بن عبداللہ)

نہ صرف یہ کہ قتل پر اُکسانا اور اُبھارنا بہت بڑا گناہ ہے، بلکہ مقتول کو بچانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلو تہی سے کام لینا بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں کسی شخص کا ظلماً قتل ہو، وہاں تم کھڑے نہ ہو، وہاں موجود رہنے والوں پر بھی اللہ کی لعنت ہوتی ہے، کہ انہوں نے اسے بچایا کیوں نہیں؟ اور جہاں کسی شخص کو ظلماً زدوکوب کیا جا رہا ہو وہاں بھی نہ ٹھہرو، کیوں کہ حاضرین پر بھی اللہ کی لعنت ہوگی، کہ انہوں نے مدافعت کیوں نہیں کی،

(طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر: ۱۱۶۷۵)

اصل یہ ہے کہ کسی شخص کو قتل کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی میں انسانی خون اور انسانی زندگی کا احترام نہیں، اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''ایک نفسِ انسانی کا قتل پوری انسانیت کو قتل کرنے اور ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے'' ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَاِنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا'' (المائدہ: ۳۲)

اس جرم کے شدید ہونے کی وجہ ظاہر ہے، زندگی اللہ کی امانت ہے، جان دینا اور جان لینا اللہ ہی کا حق ہے، قاتل گویا اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اس سے بڑھ کر تعدی اور کیا ہوگی؟ پھر خود مقتول کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے، قتل کی تکلیف کو جس سے

بڑھ کر کسی اور تکلیف کا تصور نہیں کیا جاسکتا، پھر قاتل اسے ایسی نعمت سے محروم کرتا ہے، جس کی واپسی ممکن نہیں، اور جس کا بدل نا قابلِ حصول ہے، یہ تو خود قاتل کا معاملہ ہے، پھر غور کیجئے کہ ہر انسان کے ساتھ کتنے ہی حقوق متعلق ہیں، معصوم بچوں اور بچیوں کی تربیت اس کے ذمہ تھی، جوان بہنوں کی شادی کا وہی ذمہ دار تھا، بوڑھے ماں باپ کی کفالت اسی کے سر تھی، بیوی کا سہاگ اس کے دم سے قائم تھا، خاندان کی کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں اس سے متعلق تھیں، اور سماج کی کتنی ہی اُمیدیں اور توقعات اس سے وابستہ تھیں، بہ ظاہر یہ ایک جان کا قتل ہے، لیکن در حقیقت وہ کتنی ہی تمناؤں، حسرتوں، امیدوں اور آرزوؤں کا قاتل ہے، اس نے ایک بے قصور عورت کو بیوہ کیا، معصوم بچوں کو یتیم اور بے سہارا بنایا، بوڑھے ماں باپ سے اس کا عصائے پیری چھینا ہے اور چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی امیدوں کے محل کو خاکستر کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے یقیناً اس نے ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک خاندان اور ایک کنبہ کا اور انسانیت کا قتل کیا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انتقام کا قانون رکھا کہ یا تو خود قاتل کیفرِ کردار تک پہونچا دیا جائے، (البقرہ:۱۷۸) اگر مقتول کے اولیا، رضامند ہو جائیں تو ان کو دیت ادا کی جائے، جو سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، مقصد اس دیت کا یہی ہے کہ ایک شخص کے قتل کی وجہ سے مقتول کے خاندان کو جو نقصان پہونچا ہے وقتی طور پر سہی، کچھ تو اس کی اشک شوئی ہو جائے، اور ہنگامی مدد تو اسے حاصل ہو، یہ خون بہا اس وقت بھی واجب ہے، جب کسی شخص کو دھوکہ میں قتل کر دے، (النساء:۹۲) اور اس غلطی کی صورت میں صرف دیت ہی کافی نہیں، بلکہ کفارہ بھی واجب ہے، کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے جائیں، (النساء:۹۲) اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو اس کے لئے کوئی کفارہ متعین نہیں کیا گیا، زندگی بھر توبہ واستغفار کرتا رہے، کیوں کہ یہ اتنا بڑا جرم اور اتنا شدید گناہ ہے کہ کوئی عمل اس کا کفارہ بن نہیں سکتا، یہ کفارہ اسی لئے ہے کہ حقوق اللہ میں جو دست درازی ہوئی اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے

فرمایا: کہ آج کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ حرام مہینہ، حرام دن، اور حرام سرزمین یعنی حدودِ حرم کا علاقہ ہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو اس سے بھی زیادہ قابلِ حرمت ہیں، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷) اگر اس پیغمبر رحمت کی امت بھی مسلمانوں کے بلکہ انسانوں کے خون کی اہمیت و حرمت کو نہ سمجھ سکے اور اس کے ہاتھ بھی ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں تو اس سے بڑھ کر بھی قابلِ افسوس، لائقِ حیرت اور تعجب انگیز کوئی بات ہوگی؟؟

(۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء)

ایک حادثہ —— لرزہ خیز، الم انگیز

گزشتہ دنوں شہر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ہر اس شخص کو تڑپا دیا، جس کے سینہ میں دل اور دل میں دھڑکن ہو، اخبار کی اطلاع کے مطابق ۱۹/ اور ۲۰/ جون ۱۹۹۸ء کی درمیانی شب میں محلّہ جہاں نما میں ایک خاندان نے اپنی دو بہوؤں کو نہایت ہی بے دردی اور شقاوتِ قلبی کے ساتھ مار مار کر ہلاک کر دیا، ان کو مسلسل زدوکوب کیا گیا اور بدن پانی سے تر کر کے مارا گیا، تاکہ زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچ سکے اور بالآخران کے گلے گھونٹ دیئے گئے، ان خواتین کی عمر ۲۰/ اور ۲۶/ سال تھی، ان میں ایک نے تو صرف سات ماہ قبل ہی اس گھر میں قدم رکھا تھا اور ایک کے چار بچے تھے، جن میں دو بقیدِ حیات ہیں اور یہ سب کچھ محض جادو ٹونے کے وہم میں ہوا۔

آپ سمجھیں گے کہ شاید یہ سب کچھ ان لوگوں نے کیا ہوگا جو خدا پر ایمان اور آخرت پر یقین کی دولت سے محروم ہیں، جن کے یہاں حساب و کتاب کا کوئی تصور نہیں اور جو اس دُنیا کے بعد کسی اور دُنیا کا یقین نہیں رکھتے، لیکن حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے تو پھر بھی یقین کیجئے کہ یہ سب ''مسلمان'' کہلاتے تھے اور ان کے نام مسلمانوں ہی جیسے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ایسے واقعات ہمارے سماج پر شرمناک داغ ہیں، ایسے داغ جن کو خون کے آنسو بھی نہیں دھو سکتے، برائی اور بدی کا ارتکاب گو افراد و اشخاص کرتے ہیں، ظلم و جور کا واقعہ ایک گھر میں پیش آتا ہے، لیکن درحقیقت پورا سماج اس کا مجرم ہے اور پوری سوسائٹی اس جرم میں شریک و سہیم ہے، جب سماج میں برائیوں پر ٹوکنے والی زبان نہ رہے، ہاتھ ہوں؛ لیکن ظالموں سے پنجہ آزمائی سے محروم، آنکھیں ہوں، لیکن ظلم و تعدی کے مقابلہ نابینا، طاقت و قوت اور اثر و رسوخ ہو، لیکن جرائم پیشہ عناصر کے مقابلہ

مفلوج اور کم ہمت، تو اس سماج میں ایسے واقعات کا پیش آنا بلکہ خدانخواستہ بار بار پیش آتے رہنا نہ حیرت انگیز ہے اور نہ تعجب خیز!

اسلام میں انسانی جان کی کتنی اہمیت ہے! قرآن کی نظر میں کفر کے سوا قتل مسلم ہی ایسا جرم ہے جس کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم رسید ہونا بتایا گیا ہے، (نسا:۹۳) قرآن نے خوب کہا ہے کہ ایک انسان کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہے، (مائدہ:۳۲) کیوں کہ جب انسانی زندگی کا احترام ہی رخصت ہو گیا تو کیا مرد اور کیا عورت، کیا بڑے اور کیا چھوٹے اور کیا امیر اور کیا غریب، ہر شخص کی زندگی ایسے مجرم شخص کے ہاتھوں غیر محفوظ ہے، آخری حج کے خطبہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ اس مہینہ، اس دن، اس مقام یعنی حرام مہینہ حدودِ حرم سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کی جان کی حرمت ہے، (بخاری:۱۰۴۸/۲) ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس گناہ کے بارے میں حساب و کتاب اور فیصلہ ہوگا، وہ یہی انسانی خون کا مسئلہ ہے، (ترمذی:۲۵۹/۱) اسی لئے اسلام نے قتل کی سزا بھی قتل ہی رکھی ہے اور قرآن نے کہا کہ اس میں تمہارے لئے زندگی ہے'' **ولکم فی القصاص حیوۃ**'' (البقرۃ:۱۷۹) کہ جب تک قاتل کو اپنے جرم کی قرار واقعی سزا کا خطرہ نہ ہو، بدقماش، بد طینت، خدا سے بے خوف، جرائم کے خوگر اور شر پسند عناصر کو نہ پند و موعظت کی زبان جرم سے باز رکھ سکتی ہے، نہ جرمانہ کا خوف اور نہ مختصر مدت کے لئے قید و بند کی صعوبت کا اندیشہ

پھر خاص کر اسلام نے مردوں پر عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری رکھی ہے اور یہی مطلب ہے مرد کے ''قوّام'' ہونے کا، (تفسیر قرطبی:۱۱۰/۵) اسی لئے سماجی حقوق میں اسلام نے اکثر مواقع پر خواتین کو مقدم رکھا ہے، لڑکے بالغ ہو جائیں اور خود کسب معاش کے لائق ہوں تو باپ پر ان کا نفقہ واجب نہیں، لیکن لڑکیوں کا نفقہ بہر حال ان کی شادی تک واجب ہے اور شادی کے بعد بھی اگر خدانخواستہ طلاق یا بیوگی کی نوبت آجائے تو پھر والدین پر ان کی کفالت کی ذمہ داری لوٹ آتی ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ:۷/۷۴۲) اگر ماں، باپ میں سے ایک اور بیٹے بیٹی میں سے ایک ہی کا نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت

ہے تو ماں کو باپ پر اور بیٹی کو بیٹے پر ترجیح حاصل ہے۔

غور کیا جائے تو طلاق اور ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت کا ایک اہم مقصد عورت کا تحفظ بھی ہے، اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت ہو جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے، پھر اس رشتے کو ختم کرنے کے لئے طلاق کا جائز راستہ مہیا ہے، تو مرد طلاق دے کر نجات حاصل کر لیتا ہے، عورت کی جان کے درپے نہیں ہوتا اور اگر اس کے لئے جائز راستہ باقی نہ رہے، تو پھر بدقماش لوگ اس کے لئے ناجائز اور غیر قانونی راستہ اختیار کرتے ہیں، یہی حال تعدد ازدواج کا ہے، اگر مرد کسی اور عورت کی طرف راغب ہو، قانوناً ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش نہ ہو اور طلاق حاصل کرنی بھی دشوار ہو تو پھر وہ ایک عورت کا قتل کر کے دوسری عورت کو اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اگر ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش ہو تو وہ قانونِ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے، غرض طلاق اور کسی مناسب ضرورت کے بغیر دوسرا نکاح ایک ''ناخوشگوار واقعہ'' ہے، لیکن یہ اس سے زیادہ ناخوشگوار واقعہ کو روکنے کا باعث ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

پھر نکاح کتنا پاکیزہ رشتہ ہے، شریعت کی نگاہ میں بیوی کا وجود مرد کا ایک حصہ ہے ''وخلق منها زوجها'' (نساء:۱) انسان کو اپنے حصۂ بدن سے کیسی محبت ہوتی ہے؟ اپنے بدن کا حصہ خوبصورت ہو یا بدصورت، گورا ہو یا کالا، اور صحت مند ہو یا بیمار، لیکن بہر حال وہ اسے محبوب رکھتا ہے، اسی طرح شریعت نے بیوی کو محبوب رکھنے کا حکم دیا ہے، پھر نکاح کی وجہ سے بہو اور خسر، ساس اور داماد ایک دوسرے کے لئے محرم ہو جاتے ہیں، گویا بہو کی حیثیت اپنی اولاد کی ہوتی ہے، انسان کچھ بیٹیوں کو گھر سے رخصت کرتا ہے اور کچھ بیٹیوں کو اپنے گھر میں لاتا ہے، کہ یہ دونوں ہی بیٹیاں ہیں، یہاں تک کہ اگر شوہر فوت ہو جائے یا طلاق دے دے، جب بھی بہو اپنے خسر کے لئے محرم ہی رہتی ہے، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خسر اور خوش دامن اپنی بہو کو ''بیٹی'' کی نظر سے دیکھیں اور بہوئیں ان کو والدین تصور کریں، اگر لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں تو شاید سماج میں ایسا کوئی

جھگڑا اور اختلاف باقی نہ رہے اور ہر گھر جنت نشان بن جائے۔

عورت کا قتل تو اتنا بڑا جرم ہے کہ عین میدانِ جنگ میں بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی، پیغمبر اسلام ﷺ فوجیوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ خواتین پر ہاتھ نہ اٹھائیں، (مسلم: ۲/ ۱۸۴) ایک بار سپہ سالار فوج حضرت خالدؓ کو خاص تاکید کے ساتھ فرمایا کہ عورتوں اور مزدوروں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے، لاتقتلن امرأة و لا عسیفا (ابوداؤد: ۲/ ۳۶۲) ایک غزوہ کے موقعہ سے آپ ﷺ نے ایک خاتون کی لاش دیکھی تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، (مسلم: ۲/ ۸۴) اسی لئے مشہور محدث اور فقیہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے کہ غیر مسلم عورتوں اور بچوں کے قتل کے حرام ہونے پر پوری اُمت کا اجماع واتفاق ہے، (شرح نووی علی مسلم: ۲/ ۸۴) جب عین جنگ کے دوران اور دشمن کی عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تو کسی مسلمان اور وہ بھی اپنے رشتہ داروں اور قرابت مندوں پر ہاتھ اٹھانا کتنا بڑا گناہ، کتنا شرمناک عمل اور اللہ اور اس کے رسول کے دربار میں کتنا مبغوض فعل ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔

شریعت نے شوہر کو اس کی اجازت ضرور دی ہے کہ وہ بیوی کی نافرانی کی صورت میں مناسب حد میں رہتے ہوئے اس کی تادیب کرے، لیکن یہ بھی اس وقت جب تین باتیں پائی جائیں: اولاً تو بیوی ایسی غلطی کرے جس کو شریعت غلطی قرار دیتی ہو، جیسے غیر محرموں کے سامنے نکلنا، قدرت کے باوجود شرعی حدود میں شوہر کے لئے زیبائش و آرائش نہ کرنا، کسی عذر کے بغیر شوہر کی فطری ضرورت کی تکمیل میں حارج ہونا، شوہر کو گالی گلوچ کرنا، غسل جنابت نہ کرنا اور نماز وغیرہ سے غفلت برتنا، دوسرے: پہلے ان باتوں کی فہمائش اور نصیحت کی خوب کوشش کی گئی ہو اور بار بار کی نصیحت بھی رائیگاں ہوگئی ہو، پھر چند دنوں شوہر نے ایک ہی کمرہ میں رہتے ہوئے اپنا بستر الگ رکھا ہو اور دو چار روز ترکِ تعلق کرکے اس کو متنبہ کرنے کی کوشش کی ہو، اس کے باوجود بیوی اپنی غلط روی سے باز نہ آتی ہو، تب جسمانی سرزنش کی اجازت ہے۔

پھر سرزنش بھی شرعی حدود کے اندر ہو، اس طرح نہ مارے کہ جسم پر اور جسم کے

نازک حصہ پر نہ مارا جائے ، لاٹھی اور کوڑے سے نہ مارے ، ایک ہی جگہ مسلسل نہ مارے ، رومال سے یا ہاتھ سے مارے ، لوگوں کے سامنے سرزنش نہ کرے کہ اس سے عورت کی تذلیل ہوتی ہے ، اس کو یا اس کے ماں ، باپ کو گالی دینا کسی صورت جائز نہیں ، نہ اس کو بھوکا رکھنا جائز ہے ، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بیوی کی تادیب اور سرزنش کے سلسلہ میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں اور ان سب کے باوجود حضورﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو بدترین لوگ ہوں گے وہی عورتوں پر ہاتھ اٹھائیں گے ، خسر ، خوش دامن ، نند ، دیور ، جیٹھ ، جٹھانی ، بھاوج کو کسی عورت کی سرزنش کا قطعاً اعتبار نہیں ۔

شریعت میں کسی بات پر اس وقت تک یقین کرنے کی گنجائش نہیں ، جب تک کہ اس کے لئے مناسب شرعی ثبوت فراہم نہ ہو جائے ، ضعیف الاعتقادی اور ایمان و یقین میں کمی کی وجہ سے آج کل توہمات اور شکوک وشبہات کی ایک عام فضا بن گئی ہے ، بیماری ، ابتلائیں اور آزمائشیں ، حادثات ، کاروبار میں نفع ونقصان ، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے ، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا اور جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو ، کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا ، مصیبتوں سے بچنے کے لئے خود رسول اللہﷺ نے بعض آیتیں بتائیں ہیں اور بعض دُعائیں آپﷺ کی زبانِ مبارک سے منقول ہیں ، آپﷺ نے سورۂ فاتحہ کو باعثِ شفا قرار دیا ، آیت الکرسی کو ابتلاؤں سے حفاظت کا ذریعہ بتایا ، قرآن کی آخری دوسورتیں "معوذتین" کو سحر سے تحفظ کے لیے اکسیر قرار دیا ، ایک صاحبِ ایمان کے لئے ایسی چیزوں کا پڑھنا اور خدا پر بھروسہ رکھنا کافی ہے ۔

خدا کے سوا کوئی غیب کی باتوں سے باخبر نہیں ، کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص جادوگر ہے ، مریض اگر خود کہے کہ مجھے فلاں نے جادو کیا ہے جب بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہئے ، کیوں کہ خود عامل حضرات کے بقول یہ شیطان ہے ، جو مریض پر سوار ہو کر اس کی کیفیت بیان کرتا ہے ، غور کیجئے کہ جب انسان جھوٹ بولتے نہیں تھکتا ، تو شیطان جس کو حدیث نبویﷺ کے مطابق دو مسلمانوں کے درمیان تفریق ونفرت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے ، کیا وہ جھوٹ بولتا ہوگا ؟ ؟

درحقیقت یہ سب توہمات و بدگمانیاں ہیں، جو بے دینی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، یہ کچھ بیکار قسم کے لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے اور کم ہمت و کم حوصلہ لوگ ان کی خوراک ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ بعض حضرات ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے بجائے ایسے پیشہ ور ''کھاؤ پکاؤ'' لوگوں سے مل کر اپنا مرض بڑھاتے رہتے ہیں اور اپنی دُنیا بھی ضائع کرتے ہیں اور آخرت بھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کو اس سلسلے میں باشعور بنایا جائے، تو ہماتی تصورات سے ان کو آزاد کیا جائے، معاشرہ میں حوصلۂ و ہمت پیدا کیا جائے کہ اگر ایک ہاتھ ظلم و جور کے لئے اٹھے، تو کتنے ہی ہاتھ اس ہاتھ کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کتنی ہی زبانیں اس پر لعن طعن کے تیر برسائیں اور سماج میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور الگ تھلگ محسوس کرنے لگے، ہر آنکھ جو اس پر اٹھے وہ اسے اس کی ذلت و رسوائی کا احساس دلائے اور ہر زبان جو اس پر کھلے وہ اس کی شناعت اور گراوٹ کا اعلان کرنے لگے۔

(۱۰ر جولائی ۱۹۹۸ء)

مظلوموں کی مدد — اسلامی اور انسانی فریضہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے، یہ کوئی نیا دین نہیں، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے یہ دین چلا آ رہا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے اسی نظامِ حیات اور طریقۂ زندگی کو پسند فرمایا ہے، قرآن کا ارشاد ہے: ''ان الدين عند الله الاسلام'' (آل عمران: ۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک جو دین معتبر و مقبول ہے وہ صرف اسلام ہے، اس دین کو آخری اور مکمل صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا، اب جو لوگ اس سچے دین پر ایمان لے آئیں، وہ سب گویا ایک خاندان کے افراد ہیں، اور ایمان کے رشتہ نے ان کو جوڑ رکھا ہے۔

یہ ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان ہے، جیسے پانی کے ایک قطرہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ہوا اُسے اڑا لے جاتی ہے، اور دھوپ اُسے لمحوں میں جلا کر رکھ دیتی ہے، لیکن یہی قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو وہ سمندر کی وُسعت و طاقت کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اور ایک ناقابلِ تسخیر طاقت قرار پاتا ہے، اسی طرح جب کوئی انسان ایمان لاتا ہے، تو وہ سمندر سے بھی زیادہ وسیع اور طاقتور خاندان کا ایک حصہ بن جاتا ہے، علاقے اور جغرفیائی سرحدیں، برادریاں اور زبانیں یہ سب انسانی تقسیمیں اور بٹوارے ہیں، اسلام کی نگاہ میں پوری انسانیت صرف دو گروہ میں بٹی ہوئی ہے، ایک وہ جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ابدی سچائی پر یقین رکھتا ہو، یہ قرآن کی زبان میں مسلم ہے، دوسرے وہ جو اس سچائی کے منکر ہیں، جنہیں قرآن کافر سے تعبیر کرتا ہے۔

افسوس کہ مغرب نے اخوت ایمان پر تیشہ چلانے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے قومیت کے جاہلی تصور کو جگایا اور انہیں علاقہ اور زبان اور قبیلہ

وخاندان کے نام پر تقسیم کرنے کی بے جا کوشش کی، اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک کنبہ اور خاندان ہیں اور ہم سب اس خاندان کے افراد ہیں، اُخوت اسلامی کا یہ رشتہ تمام رشتوں سے زیادہ عزیز اور یہ تعلق تمام تعلقات سے زیادہ محبوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آفاقی خاندان کے باہمی رشتۂ محبت کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان فرمایا، آپ نے فرمایا:

> تم اہلِ ایمان کو باہمی رحم دلی اور محبت ومودت میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے، کہ اگر ایک عضو کو بھی تکلیف ہو تو اس کے لئے پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(بخاری، عن نعمان بن بشیر، حدیث نمبر: ۶۰۱۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے، پھر خود رسول اللہ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر اس کو عملی مثال کے ذریعہ سمجھایا: **المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً**

(بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۰۶)

یہ رشتہ درد ومحبت کا رشتہ ہے، دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر کوئی آزمائش آئے، ہر مسلمان کو اس پر تڑپ اٹھنا چاہئے، ایک مسلمان کو کوئی زخم لگے تو دوسرا اپنے سینے پر اس کی کسک محسوس کرے، ایک مسلمان پر کوئی پتھر پھینکا جائے، تو دوسرے کو اپنے کلیجہ پر اس کی چوٹ محسوس ہو، اس وقت ہمارے ملک میں گجرات کے مسلمان بھائی ہندو دہشت گردوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، ہزاروں افراد قتل کر دیئے گئے، سینکڑوں مرد وعورت زندہ نذر آتش کر دیئے گئے، چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں بلکہ پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ تک کو ظلم وجور کا نشانہ بنایا گیا ہے، شاید آسمان کی آنکھوں نے ایسے مظالم کم دیکھے ہوں گے، اس صورتِ حال نے بجا طور پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان تمام لوگوں کو جن کے اندر انسانیت کی کوئی رمق باقی تھی لرزہ براندام کر کے رکھ دیا ہے، اور پورے ملک سے مسلمان گجرات

کے لئے، اپنے بھائیوں کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ گجرات کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والوں میں مسلمانانِ حیدرآباد نے سب پر سبقت حاصل کی ہے، ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہم گجرات کے مظلوم بھائیوں کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ احسان نہیں، بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، اور مسلمانانِ گجرات کو یہ سزا اُن کے مسلمان ہونے اور پورے ملک میں اسلامی کاز کی مدد کرنے کی وجہ سے دی گئی ہے۔

مدد کا ایک طریقہ تو ہنگامی ہے، یعنی عارضی طور پر کچھ کھانے، پینے کے سامان دے دیئے، کچھ برتن اور کپڑوں کا نظم کر دیا، یہ تو ضروری ہے ہی، لیکن اصل مسئلہ پائیدار بنیادوں پر ان مشکلات کو حل کرنے کا ہے، یہ زیادہ اہم ہے، اس وقت بہت سے لوگ سر چھپانے کے لئے سایہ سے بھی محروم ہو چکے ہیں، ان کے لئے مکانات کی تعمیر ان کی مصیبت اور پریشانی کو حل کرنا ہے، بہت سے لوگ وہ ہیں کہ جنہیں ان کی آبادیوں سے نکال دیا گیا ہے، اور ایمان سے محرومی کی قیمت پر ہی ان کو واپسی کی اجازت دی جا رہی ہے، جو ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے لئے زندگی اور جان کی قربانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان کے لئے مسلمانوں کے کثیر آبادی والے علاقوں میں زمین خرید کر بستیاں بسانا ضروری ہے، بہت سی خواتین بیوہ ہو چکی ہیں، ان کی زندگی کے لئے گذر اوقات کا مسئلہ ہے، کہ اگر ان کی شادی کر دینا قرینِ مصلحت ہو اور وہ اس پر آمادہ ہوں، تو مسلمان اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہوں، اور بیوہ عورتوں سے نکاح کی جو سنت رسول اللہ ﷺ نے چھوڑی ہے، اس سنت کو تازہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے بیوہ اور مسکین لوگوں کی خدمت کرنے والوں کو، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے یا دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں تہجد پڑھنے والے کے برابر قرار دیا، **الساعی علی الارملة والمساکین کالمجاهدین فی سبیل الله او کالذی یصوم النهار یقوم اللیل** (بخاری عن صفوان، حدیث نمبر: ۶۰۰۶) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں مصیبت کو دور فرمائے گا، جس نے کسی تنگ دست پر آسانی پیدا کی، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے ساتھ آسانی فرمائیں گے، جو کسی مسلمان کی غلطی کو چھپائے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی ستاری فرمائیں گے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس بندہ کی مدد کی طرف متوجہ رہتے ہیں، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۹۴۶) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت ان مظلوم بھائیوں کی مدد کس قدر اہم اور اجر و ثواب کا سامان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حاجت مندوں کی اعانت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا ہے، جسے سُن کر ہر شخص کا دل پسیج جائے، آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے، اے ابنِ آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا، پروردگار! میں کیسے آپ کی عیادت کرسکتا تھا، آپ تو خود سارے جہان کے رب ہیں، ارشاد ہوگا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تم اس کی عیادت کرتے تو تم مجھے اس کے پاس پاتے — پھر ارشاد ہوگا، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھلایا نہیں، بندہ عرض کناں ہوگا: میرے پروردگار! آپ تو تمام عالم کے رب ہیں، آپ کو میں کیوں کر کھانا کھلاتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ تجھ سے کھانے کا طلب گار ہوا تھا، تم نے اسے نہیں کھلایا، اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے وہاں موجود پاتے، پھر اللہ کہیں گے: اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، اور تو نے مجھے نہیں دیا، بندہ ملتجی ہوگا! میرے پروردگار! آپ تو کائنات کے رب ہیں، میں آپ کو کس طرح پلاتا، فرمانِ باری ہوگا، تجھ سے میرے فلاں بندے نے تو پانی مانگا تھا، تو نے اسے پانی نہیں دیا، اگر تو اسے پلاتا تو مجھے وہاں موجود پاتا، (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۵۶) — گویا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی مدد کرنا براہِ راست اُسے اللہ کے حضور پہونچانا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں مخلوق کی خدمت اور

بندوں کی حاجت روائی کی کیا اہمیت ہے؟۔

انسان کو سب سے زیادہ فکر اور خواہش درازی عمر اور خوش معاشی کی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو چاہتا ہو کہ اس کی رزق میں وسعت اور عمر میں برکت ہو تو اسے صلہ رحمی کرنا چاہئے (بخاری، حدیث نمبر: ۵۹۷۵) ___ جو لوگ آخرت کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کے نظامِ غیبی پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ یقیناً مژدہ جانفزا ہے۔

ایک اہم مسئلہ یتیم ہونے والے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی کفالت کا ہے، اس سلسلہ میں بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ مسلمان حسب استطاعت ایک دو بچوں کی کفالت قبول کرلیں، اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کی پرورش کریں، خاص کر جو لوگ صاحب اولاد نہیں ہیں، ان کے لئے یہ نہایت ہی بہتر صورت ہے، یہ ایک دو یتیم لڑکے یا لڑکی کی کفالت ان شاء اللہ ان کے لئے برکت ہی ثابت ہوگی، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ سنت بھی ادا ہو سکے گی، جو یتیم کی کفالت کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے قائم فرمائی تھی، کئی ازواجِ مطہرات جو آپ ﷺ کی نکاح میں آئیں وہ اپنے ساتھ یتیم بچوں کو بھی لے کر آئیں، اور آپ ﷺ نے انہیں بوجھ نہیں بلکہ خدا کی ایک نعمت سمجھ کر قبول فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۰۰۵) ___ مومن کے لئے یہ کس قدر مسرور کن خوشخبری ہے! اور جو لوگ دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت سے محروم ہیں، ان کے لئے آخرت میں اس سعادت کو حاصل کرنے کا کتنا آسان نسخہ ہے! ___ یتیموں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ ایسے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم بچوں کے لئے یتیم خانے بھی قائم کرنے ہوں گے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں اجتماعی کفالت کے زیر سایہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکیں، اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے سلسلہ میں ایسی بات ارشاد فرمائی ہے کہ جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کو

بھی پگھلا کر رکھ دے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کو یہ سوچ کر ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے بارے میں کیسے کچھ اندیشے ہوتے، اس لئے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور درست بات کہنا چاہئے (النساء: ۹۰)__ کیسی چونکا دینے والی بات ہے، کسی کو یہ خبر نہیں کہ اس کے بچوں کی پرورش اس کے ہاتھوں ہوگی، یا وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے گزر جائے گا، اور اگر وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے بلا لیا جائے تو اپنے بے سہارا بچوں کے بارے میں اس کے کیا جذبات و احساسات ہوں گے؟۔

(۳۱ رمئی ۲۰۰۰۲ء)

سب سے بڑی بہادری

انسان مجموعۂ اضداد ہے، طاقت ور ایسا کہ سمندر اور پہاڑ بھی اس کی ٹھوکروں میں ہے، اور کمزور ایسا کہ پانی کا معمولی سا تلاطم اور پہاڑ کا ایک سنگ ریزہ بھی اس کی موت کے لئے کافی ہے، لطیف ایسا کہ غنچۂ وگل بھی اس پر نثار ہو، اور ذوق سے محروم ہو تو کثیف ایسا کہ شاید کوئی اخلاقی اور مادی آلائش اس کا مقابلہ کر سکے، محبت کرے تو شبنم اور بادِ نسیم سے بھی زیادہ خنک، اور نفرت پر اتر جائے تو آتش فشاں بھی اس کی گرمی عداوت پر شرمائے، اسی طرح انسانی فطرت میں ایک اہم عنصر غصہ، غیظ وغضب اور جوش وانتقام کا ہے، یہ ایک آگ ہے جو انسان کے سینہ کو سلگا کر رکھ دیتی ہے، اور اس کا انگ انگ اس کی حرارت سے دہک اٹھتا ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، زبان بے قابو ہو جاتی ہے، اور جب غصہ شدید ہو تو اپنے اعضاء پر بھی انسان کی گرفت باقی نہیں رہتی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، گویا غصہ کی حالت میں انسان شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے، اور شیطان اس کو اپنے مقصد و منشاء کی تکمیل کے لئے ذریعہ بناتا ہے۔

غصہ کی کیفیت انسان کو دینی اعتبار سے بعض اوقات سخت خسارہ میں ڈال دیتی ہے، زبان سے کفریہ کلمات نکل جاتے ہیں، آدمی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو سراسر تقاضۂ دین وایمان کے مغائر ہوتی ہیں، یہی جوشِ غضب انسان کو قتل وقتال اور سب وشتم تک پہونچا دیتا ہے، دینی نقصان تو ہے ہی، دنیوی نقطۂ نظر سے بھی انسان کچھ کم نقصان سے دو چار نہیں ہوتا، بہت سے واقعات ہیں کہ بیوی کو طلاق دے دیتے ہیں، بعض مغلوب العقل حضرات خودکشی کر بیٹھتے ہیں، شدتِ غضب میں اپنا ہی سامان توڑ پھوڑ کرنے سے گریز

نہیں کرتے، غصہ کی وجہ سے انسانی دماغی مریض بھی بن سکتا ہے، اور قلب پر حملہ سے بھی دوچار ہوسکتا ہے ـــــ اگر معاشرہ کے مفاسد کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر برائیاں غصہ ہی کی دین ہیں، خاندانوں کی باہمی نفرت، میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلے، ایک دوسرے کی عزت ریزی، صلح کے مواقع تلاش کرنے کے بجائے مقدمہ بازی اور جنگ و جدال کا تسلسل، سماج کی یہ مہلک بیماریاں نوے فیصد غصہ ہی کے سبب ہیں، اسی لئے اسلام میں غصہ کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اور غصہ پر قابو پانے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ایلواء شہد کو خراب کر دیتا ہے، اسی طرح غصہ ایمان کو، ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ جہنم کے قریب ہو جاتا ہے، (احیاء العلوم: ۱۶۵/۳) آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جس کو غصہ جلد آئے اور ختم ہو دیر سے، **شرھم سریع الغضب بطئی الفئی**، اور بہترین آدمی وہ ہے جسے غصہ دیر سے آئے اور جلد چلا جائے، **خیرھم بطئ الغضب سریع الفئی** (ترمذی، حدیث: ۲۱۹۱) ایک بار آپ ﷺ کا گذر کچھ لوگوں پر ہوا، کچھ لوگ پتھر اٹھا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: پتھر اٹھا رہے ہیں، لوگ ان کی بہادری بیان کرنا چاہ رہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ان سے بھی بہادر آدمی نہ بتلاؤں؟ پھر ارشاد فرمایا: ان سے بھی بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سے آپ ﷺ گذرے، جو منتشر حالت میں تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: فلاں پہلوان ہے کہ جس پہلوان سے بھی کشتی لڑتا ہے اسے زیر کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بھی زیادہ پہلوان شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ اس سے بھی بڑا بہادر وہ شخص ہے جس پر کوئی شخص ظلم کرے، اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے۔ اس نے اپنے غصہ پر بھی غلبہ پایا اور اپنے شیطان پر بھی، اور اپنے حریف کے شیطان پر بھی، (مجمع الزوائد: ۶۸/۸) ایک اور روایت میں ہے کہ اصل بہادر وہ ہے کہ جسے غصہ آئے خوب غصہ آئے،

چہرہ سرخ ہو جائے اور بال کھڑے ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنے غصہ پر قابو پالے۔

(حوالۂ سابق: ۶۹/۸)

اسی لئے رسول اللہ ﷺ خاص طور پر غصہ سے بچنے کی نصیحت فرماتے، ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کی خواہش کی، آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کرو، وہ بار بار پوچھتے رہے، اور آپ ﷺ بار بار یہی جواب دیتے رہے، حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ نے عرض کیا: کہ مجھے کوئی مفید مگر مختصر نصیحت فرمائیے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کرو، وہ بار بار نصیحت کی درخواست کرتے رہے، اور آپ ﷺ ہر بار یہی جواب ارشاد فرماتے: (مجمع الزوائد: ۷۰/۸، بحوالہ طبرانی) حضرت ابو درداء ﷺ نے درخواست کی کہ ایسا عمل ارشاد فرمایا جائے جو مجھے جنت میں داخل کردے، فرمایا: غصہ نہ کرو، (حوالۂ سابق) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایسا عمل جاننے کی خواہش کی جو خدا کے غضب سے بچانے والا ہو، اب بھی یہی ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کرو، (حوالۂ سابق: ۶۹/۸، بحوالہ مسند احمد) ایک صحابی ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی، آپ ﷺ نے غصہ سے بچنے کو فرمایا، میں نے اس میں غور کیا تو محسوس کیا کہ غصہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ **الغضب یجمع الشر کله** (حوالہ سابق)

اہلِ علم نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بچوں کو خاص طور پر غصہ کی کثرت سے منع فرمایا، اور کہا: **ایاك و کثرة الغضب** (احیاء العلوم: ۱۶۵/۳) امام جعفرؒ کا قول منقول ہے کہ غضب ہر برائی کی کلید ہے، **الغضب مفتاح کل شر**، حضرت عمر ﷺ اکثر اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص حرص، خواہشِ نفس اور غصہ سے بچ گیا وہ کامیاب ہو گیا، مشہور محدث عبد اللہ ابن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ایک جملہ میں حسنِ اخلاق کو بتائیے، امام صاحبؒ نے فرمایا: غصہ چھوڑ دو، **اترك الغضب**،

(احیاء العلوم: ۱۶۶/۳)

اسی لئے غصہ کو پی جانے پر بڑا اجر ہے، حضرت معاذ بن انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص غصہ اتارنے پر قادر ہو، اس کے باوجود وہ غصہ پی جائے، اللہ تعالیٰ

اس کو قیامت کے دن تمام مخلوقات کی موجودگی میں (از راہِ اعزاز) طلب فرمائیں گے، اور اسے اختیار دیں گے کہ جس حور کا چاہے انتخاب کر لے، (ترمذی، حدیث نمبر:۲۰۲۱) اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غصہ پر قابو پانا اور غصہ کے وقت اپنے آپ کو عدل اور اعتدال پر قائم رکھنا آسان نہیں، اور انسان کے اخلاق ورواداری کا اصل امتحان اسی موقع پر ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خوب فرمایا کہ آدمی کی بردباری کو اس وقت دیکھو جب وہ غصہ کی حالت میں ہو، اور اس کی امانت ودیانت کا اندازہ اس کی طمع وحرص کے مواقع پر، جس کو تم نے حالتِ غضب میں نہیں دیکھا، تم کو اس کی بردباری کا علم نہیں، اور جس کو تم نے حرص ولالچ کے مواقع پر نہیں دیکھا، تم کو اس کی دیانت کی خبر نہیں، (احیاء العلوم:۱۶۶/۳)

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا بہت بڑا عمل ہے، اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا، نہایت ہی بہادری کا کام ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کی مختلف تدابیر بتائی ہیں، آپ ﷺ نے اس کی ایک تدبیر یہ بتائی کہ ایسے وقت میں آدمی ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' پڑھے، ایک صاحب اتنا غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ اب ان کی ناک پھٹ پڑے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہے تو اس کا غصہ فرو ہو جائے، دریافت کیا گیا: وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' (ابوداؤد حدیث:۴۷۸۰، بخاری حدیث:۶۰۴۸) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غصہ ایک شیطانی حرکت ہے، جب انسان اس موقع پر تعوذ پڑھے گا، تو اللہ کی مدد سے اس شیطانی حرکت پر غلبہ پالے گا، نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کلمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا ذہن اس جانب منتقل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شیطان کا آلۂ کار ہے، اس خیال سے وہ اپنے آپ کو موجودہ کیفیت سے بآسانی نکال سکے گا۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصہ کے وقت انسان کچھ نہ بولے اور چپ سادھ لے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو خاموش رہے، **اذا غضب احدکم فلیسکت**، (مسند احمد، حدیث نمبر:۲۱۳۷) کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان جتنا زیادہ بولتا ہے، جوشِ غضب بڑھتا جاتا ہے، اور اکثر اوقات ایسی

باتیں کہہ جاتا ہے جو خود اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے ___ غصہ کو روکنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ انسان اپنی موجودہ کیفیت میں تبدیلی لے آئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو غصہ کے وقت اس تدبیر کے اختیار کرنے کا حکم فرمایا تھا، (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۷۸۲ عن ابی ذر غفاریؓ)

ابو وائلؒ ایک واعظ تھے، وہ عروہ بن محمد سعدیؒ کے پاس گئے، عروہؒ سے ایک شخص نے ایسی بات کہی کہ ان کو غصہ آ گیا، وہ اٹھ گئے، اور وضوء کر کے واپس آئے، پھر ایک حدیث بیان فرمائی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہے، شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضوء کر لینا چاہئے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۸۴) ___ معلوم ہوا کہ وضوء بھی غصہ پر قابو پانے میں ایک مؤثر طریقہ ہے، روحانی طور پر تو وضوء میں غصہ فرو کرنے کی تاثیر ہوگی ہی، کیوں کہ یہ ارشادِ نبویؐ ہے اور آپ ﷺ کے ارشاد سے بڑھ کر صحیح و درست بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن علاوہ اس کے نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پانی کی ٹھنڈک جسم کی حرارت، تکان، اور غیر معتدل کیفیت کو دور کرنے اور معتدل بنانے میں بہت مؤثر ہوتی ہے، امام غزالیؒ نے کچھ اور تدبیریں بھی غصہ پر قابو پانے کی بتائی ہیں، ان میں یہ ہے کہ غصہ پر قابو پانے کے فضائل سے متعلق آیات و احادیث کو اپنی نگاہ میں رکھے، اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، غصہ سے انجام کار عداوت و انتقام کی جو آگ فریق مخالف کے دلوں میں سلگے گی اس کو اپنے ذہن میں مستحضر کرے، غصہ کے وقت آدمی کی صورت میں جو بگاڑ آتا ہے اس کو ذہن میں لائے، اور سوچے کہ گویا وہ اس کیفیت میں ایک کاٹ کھانے والے کتے اور حملہ کرنے والے درندے کی طرح ہے، وغیرہ (احیاء العلوم: ۳/ ۱۷۳-۱۷۴)

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تدابیر کا حاصل اور غصہ پر قابو پانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خدا کا خوف ہے، خدا سے بے خوفی انسان کو ظلم پر جری بناتی ہے، اور خدا کا خوف انسان کے بے قابو جذبات کو تھام لیتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جن کو زیادہ

غصہ آتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ احکام خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں تھی، اسی لئے ان کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے: کان وقافا عند کتاب الله ایسا بھی ہوا کہ آپؓ نے کسی شخص کو اس کی غلطی کی بناء پر کوڑے لگانے کا حکم دیا، اس نے آیت قرآنی پڑھ دی کہ ''عفو درگذر'' کو اختیار کرو۔ بھلائی کا حکم دو، اور ناواقف لوگوں سے گریز برتو۔ ''خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاهلين'' (اعراف: ۱۹۹) حضرت عمرؓ نے ایک لمحہ غور فرمایا اور اس کو چھوڑ دیا۔ (احیاء العلوم: ۱۷۳/۳) اگر سینہ میں خوفِ خدا کی آگ موجود ہو، تو وہ غصہ کی آگ کو کھا جائے گی، اور اگر دل خوفِ الٰہی سے خالی ہو تو غصہ کی آگ اسے کھا جائے گی دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ غصہ برائیوں کی جڑ ہے اور غصہ پینا سب سے بڑی بہادری۔

(۱ر اکتوبر ۱۹۹۹ء)

گداگری اور اس کا سدِّ باب

آج کل ہماری مسجدوں، مذہبی مقامات اور دینی اجتماعات کی ایک پہچان گداگروں کا ازدحام اور ایک خاص لَے اور دھن میں ان کی طرف سے سوالیہ کلمات کی تکرار بھی ہے، ان میں بعض کے اندر الحاح کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور آپ کے لئے ان کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا دشوار ہوتا ہے، بعض کی جرأت رندانہ بھی قابل دید ہوتی ہے، اگر آپ نے انہیں بھیک نہیں دی یا بھیک کی مطلوبہ مقدار نہیں دی، تو ان کی خشمگیں نگاہ کو سہے بغیر چارہ نہیں، کچھ ایسے فرزانے بھی ہیں جو آپ کو دو چار صلواتیں سنانے سے بھی نہیں چوکتے، وہ اس طرح سوال کرتے ہیں کہ ناواقف آپ کو ان کا مقروض سمجھ بیٹھے، مذہبی مقامات کے علاوہ سیاحتی مقامات، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ٹریفک سگنل کی جگہیں جہاں گاڑیوں کے رکنے کی نوبت آتی رہتی ہے، اس گروہ کے پسندیدہ اور مستجاب مقامات ہیں، اس لئے یہاں ان کی وافر تعداد نہ صرف یہ آموجود ہوتی ہے، بلکہ کمالِ اخلاص اور کمالِ استقامت کے ساتھ صبح کی پَو پھٹنے سے لے کر رات گئے تک اپنے محاذ پر ڈٹی رہتی ہے، پولیس والوں کا محصول اور گاہے ڈنڈوں کے ذریعہ ان کی تنبیہ اور دینے والوں کی ڈانٹ ڈپٹ ان کو نہ ملول خاطر کرتی ہے، اور نہ ان کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل آنے دیتی ہے، اس لحاظ سے ثابت قدمی میں وہ ایک نمونہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ گداگری بھی انواع واقسام کے ہیں، کچھ صحت مند وتوانا، کچھ واقعی مریض اور زیادہ تر مصنوعی مریض، مریض اور معذور عام طور پر بیکار شمار کئے جاتے ہیں، لیکن اس میدان میں وہ نہایت کارآمد اور مفید ہیں، اسی لئے بہت سے صحت مند بھکاری نابینا اور معذور فقیروں کا تعاون حاصل کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد سے پتھر دلوں کو موم بنانے

کا کام انجام دیتے ہیں، ان میں بچے بھی ہیں، جوان بھی، اور بوڑھے بھی، مرد بھی ہیں اور خواتین بھی، کم سن لڑکیاں بھی جوان لڑکیاں اور سن رسیدہ عورتیں بھی گداگری کے اس پیشہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، ایسے گروہ بھی پکڑے گئے ہیں جو دیہاتوں اور دور دراز علاقوں سے بچوں کو پکڑ کر لاتے ہیں، اور انہیں کسی قدر معذور بنا کر ان سے گداگری کراتے ہیں، زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ گداگری کے لئے بھی جدید ذرائع کا استعمال شروع ہوگیا ہے، چنانچہ بعض فقراء انٹرنیٹ کی مدد سے عالمی سطح پر اپنی رسائی کو وسیع کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گداگروں کا یہ گروہ اس کو ایک آسان اور سہولت بخش ذریعہ معاش تصور کرتا ہے، چند ماہ پہلے اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ حیدرآباد میں گداگروں کی آمدنی کا اوسط تین تا چار ہزار روپے ماہانہ ہے، خاص خاص مواقع جیسے رمضان المبارک اور عید وغیرہ میں اس میں خاصا اضافہ ہوجاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اس پیشہ سے دستبردار ہونے کو کسی طور تیار نہیں ہیں، اگر آپ انہیں کام کرنے کو کہیں یا خود اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دیں تو وہ ایسا منہ بنائیں گے کہ گویا آپ نے ان کی بے عزتی کی ہے، غرض وہ اپنے پیشہ پر قانع بھی ہیں اور مطمئن بھی، اور انہیں اس پر نہ کوئی حجاب ہے اور نہ عار، اس بات سے مزید دکھ ہوتا ہے کہ ان میں بہت ہی قابلِ لحاظ تعداد ہمارے مسلمان بھائیوں کی ہے، اور جس امت کو سب سے بڑھ کر غناء اور استغناء کی تعلیم دی گئی ہے، وہی اس اخلاقی بیماری میں پیش پیش ہے۔

اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں مذہبی لوگوں کے لئے کسبِ معاش کی اجازت نہیں تھی، اور ان کا گزر اوقات اسی طرح ہوتا تھا، کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں اور لوگوں کی نذر و نیاز پر زندگی گزاریں، ہندو بھائیوں کے یہاں برہمن کے حقوق میں یہ بات شامل تھی کہ لوگ اسے دان کیا کریں، بدھشوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں اور بھگتوؤں کو کسبِ معاش کی ممانعت ہے، اور وہ لوگوں کی دچھنا پر زندگی گزارا کرتے تھے، عیسائیوں کے یہاں جب رہبانیت اور ترکِ دنیا کے فلسفہ نے قبولِ عام حاصل کیا تو نہ

صرف مذہبی رہنما، بلکہ عوام میں بھی زاہد قسم کے لوگوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ وہ کسبِ معاش چھوڑ دیں اور لوگوں کے دیئے ہوئے پر اپنی زندگی گزاریں، لیکن اسلام نے اوّل روز سے ہی کسبِ معاش کو ضروری قرار دیا، قرآن نے کہا کہ اللہ کی بندگی سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کی کوشش کرنی چاہئے، اور مال کو فضلِ الٰہی سے تعبیر کیا (الجمعہ: ۱۰/۲۸) رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اکابرِ صحابہؓ نے تجارت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہؓ نے محنت ومزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کیں اور تلاشِ رزق کی تحسین فرمائی گئی۔

اسلام نے توکل کی تعلیم ضرور دی، لیکن لوگوں نے جو بے عملی اور فرائض سے پہلوتہی کو توکل کا نام دے رکھا تھا، اس کی اصلاح بھی فرمائی، اسلام نے بتایا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ اسبابِ دنیا کو ترک کر دیا جائے، بلکہ توکل اسباب کو اختیار کرنے کے بعد نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینے کا نام ہے، اس لئے کسبِ معاش توکل کے منافی نہیں، گداگری پیدا ہی اس لئے ہوتی ہے، کہ انسان کسبِ معاش کی تگ ودو سے دل چرانے لگے، اس کے سدِ باب کے لئے آپ ﷺ نے ایک طرف کسبِ معاش کی اہمیت کو واضح فرما کر گداگری کے اصل سبب کو ختم کرنا چاہا۔

اور دوسری طرف گداگری کی مذمت فرمائی، اور اسے سختی سے منع کیا، ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کچھ سوال کیا، آپ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا کچھ سامان ہے؟ اس نے کہا میرے پاس تو محض ٹاٹ اور پیالہ ہے، آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان کی ڈاک لگائی، ایک صاحب نے ایک درھم قیمت لگائی، دوسرے شخص نے دو درھم، آپ نے اسے دو درھم میں فروخت کر دیا، پھر ایک درھم میں کلہاڑی کا پھل منگایا اور کلہاڑی بنا کر اسے حوالہ کر دیا، اور ایک درھم اسے دے کر ارشاد ہوا کہ اس سے اپنی ضرورت پوری کریں، اور کلہاڑی سے لکڑی کاٹ کر لائیں اور فروخت کریں، اور ایک ماہ تک پھر کہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر نہیں آئیں، ان صاحب نے اس ہدایت پر عمل کیا، اور ایک ماہ کے بعد اس حال میں تشریف لائے کہ کئی درھم ان کے پاس

موجود تھے، اور وہ گداگری کو چھوڑ چکے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ بات کہ تم اپنی پیٹھ پر لکڑی کے گٹھے کاٹ کر لاؤ اور اسے فروخت کرو اس سے بہتر ہے کہ تم لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاؤ، وہ چاہیں تو دیدیں، چاہے تو نہیں دیں۔

اس طرح کے بعض اور واقعات بھی منقول ہیں، حضرت ابو ہریرۃ ﷛ راوی ہیں کہ دو شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور کچھ طلب کیا، آپ نے مشورہ دیا کہ جنگل جاؤ لکڑی کاٹو اور اسے فروخت کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے لکڑیاں بیچ کر کھانے کی اشیاء خریدیں، پھر سونا خرید کیا، پھر سواری کے لئے گدھے خرید کئے، اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کے حکم میں برکت رکھا ہے۔

(مجمع الزوائد: ۹۴/۳)

آپ ﷺ نے سوال کرنے سے صحابہ کو اس درجہ منع فرمایا اور اس کی تعلیم دی کہ وہ معمولی چیزیں مانگنے سے بھی احتراز کرتے تھے، حضرت ابوبکر ﷛ کا حال یہ تھا کہ اگر اونٹنی کا لگام نیچے گر جاتی، تو اونٹنی کو بٹھاتے اور خود لگام لیتے، لگام بھی دوسروں سے مانگنے کے روادار نہیں ہوتے۔ (حوالہ سابق) یہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا نتیجہ تھا، حضرت ابوذر غفاری ﷛ اور حضرت ثوبان ﷛ دونوں کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے عہد لیا کہ کسی سے سوال نہ کریں، یہاں تک کہ اگر کوڑا اپنے نیچے گر جائے تو وہ بھی دوسرے سے نہ مانگیں۔

(مجمع الزوائد: ۹۳/۳)

حضرت علی ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مستغنی ہونے کے باوجود سوال کرے، وہ اپنے لئے جہنم کی چنگاریوں میں اضافہ کر رہا ہے، دریافت کیا گیا: مستغنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ ''وَمَا ظَهرَ غِنِيَ'' ارشاد ہوا: جس کے پاس رات کا کھانا موجود ہو، (حوالۂ سابق) گویا جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا موجود ہو اس کے لئے دستِ سوال دراز کرنا روا نہیں، حضرت عبد اللہ ابن عمر ﷛ فرماتے ہیں کہ سوال قیامت کے دن صاحب سوال کے چہرے پر خراش کی صورت میں ظاہر ہوگا، اب جو چاہے اسے اپنے چہرہ پر باقی رکھے، (حوالۂ سابق: ۹۶) اور حضرت حبشی بن جنادہ ﷛ کی روایت

میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے فقر و محتاجی کے بغیر سوال کیا، گویا وہ چنگاری کو کھاتا ہے، (حوالۂ سابق) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ پیسہ رکھنے کے باوجود سوال کرنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر عیب کی صورت اختیار کرلے گا، کانت شینا فی وجهه یوم القیامة (حوالۂ سابق) غور کیجئے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں اگر چہرے پر بدنما دھبہ آجائے تو انسان اس کو دور کرنے کے لئے کتنا پریشان ہوتا ہے، آخرت کی دائمی زندگی میں جب اہلِ جنت خوبصورت ترین شباہت میں ہوں گے، انسان کو اپنے عیب دار اور داغ دار چہرے پر کتنی شرمساری ہوگی، خاص کر ایسی صورت میں کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ رنگ و نور کی اس بستی میں کوئی شخص اتفاقی اور پیدائشی طور پر بدصورت نہیں ہے، بلکہ اس کی بدصورتی اس کی بداعمالیوں کا عکس ہے، کتنا عجیب ہے کہ بننے سنورنے والا انسان اس دائمی بدروئی اور بدصورتی کے بارے میں فکر مند نہ ہو!

گداگری فقر و احتیاج کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا اصل سبب تن آسانی و سہل انگاری، اور مفت خوری و بطن پروری کی خو ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نے حیاء اور غیرت کی چادر کو تار تار کردیا ہے، اگر انسان میں قوتِ ارادی اور خودداری ہو اور اپنی عزت و آبرو عزیز ہو، تو وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلا سکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے آپ کو عفیف و آبرو مند رکھنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے عفیف رکھتے ہیں، اور جو مستغنی رہنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے استغنا عطا فرماتے ہیں، (مجمع الزوائد: ۹۵/۳، بحوالہ مسند احمد) ___ خودداری کے اسی مزاج کو باقی رکھنے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا، کہ لوگ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کریں، اور بیت المال ضرورت مندوں کا حسبِ ضرورت تعاون کرے، کیوں کہ سرکاری ادارہ سے کوئی مدد حاصل کرنے کی صورت انسان کا جذبۂ خودداری ختم نہیں ہوتا اور حجاب و حیاء کی کیفیت باقی رہتی ہے، جب انسان ایک دوسرے سے سوال کرنے لگتا ہے تو پہلے زبان کھولے نہیں کھلتی، دل پر پتھر رکھ کر اپنا مطلب پھیلاتا ہے، تو نہ آنکھوں میں خجالت کی کیفیت ہوتی ہے، نہ زبان کو اظہارِ مدّعا میں کوئی جھجک باقی رہتی ہے، اور نہ ہاتھ کو لوگوں کے سامنے دراز ہونے میں

کوئی عار۔

کسی بھی قوم کے لئے یہ بات نہایت شرمناک ہے کہ چھوٹے بچے جو قوم کے مستقبل ہوتے ہیں، جوان مرد و عورت جن میں محنت اور تگ و دو کی صلاحیت ہوتی ہے، جو قوم کا اثاثہ اور اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، ان میں بے عملی اور بے ضمیری پیدا ہو جائے، اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

گداگری کے سدِ باب کے لئے مثبت اور منفی اقدامات کی ضرورت ہے، مثبت اقدام یہ ہے کہ ایسے بچوں کو تعلیم میں لگایا جائے، بہت سے سرکاری وغیر سرکاری ادارے ہیں جہاں بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام ہے، انہیں ایسے اداروں میں پہنچایا جائے، جو خواتین اور مرد کام کرنے کے لائق ہیں انہیں مزدوری پر لگایا جائے، آج کل مزدوروں کی کھپت بہت زیادہ ہے، اصل دشواری تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لئے ہے، اور گداگری کے پیشہ میں زیادہ تر ناخواندہ اور ان پڑھ لوگ ہیں، انہیں محنت مزدوری پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، جو لوگ واقعی جسمانی اعتبار سے معذور ہوں ان کے لئے اقامت گاہیں قائم کی جائیں، یا گورنمنٹ کی طرف سے بنے ہوئے رفاہی اداروں تک ان کو پہنچایا جائے۔

منفی اقدام سے مراد یہ ہے کہ گداگری کی حوصلہ شکنی کی جائے، مسجدوں اور درگاہوں کے ذمہ داران انہیں وہاں بیٹھنے اور بھیک مانگنے سے روکیں، مذہبی اجتماعات، جمعہ و عیدین کے مواقع پر بھی انہیں بھیک مانگنے سے منع کیا جائے اور ان کی حوصلہ شکنی کی جائے، ان کو بھیک نہیں دی جائے، یہ بھیک مانگیں تو کام کرنے کی ترغیب دی جائے، اس طرح ان کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور یہ باعزت طریقہ پر کمانے کے عادی ہوں گے بہت سے لوگ جمعہ وغیرہ میں کھلے پیسے لے کر آتے ہیں، اور روپیہ دو روپیہ ہر فقیر کو دیتے چلے آتے ہیں، بہ ظاہر یہ کارِ خیر ہے، لیکن بالواسطہ یہ اپنی قوم کے ایک گروہ کو گداگری کا عادی بنانا ہے، اس لئے اس سے اجتناب ہی قوم کے مفاد میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے، کہ ایک طرف آپ نے بھیک

مانگنے والوں کو دینے سے انکار کر دیا، اور دوسری طرف انہیں محنت و مزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب بھی دی، اور اس کی تدبیر بھی فرمائی، اگر ہم اپنی قوم کو اس لعنت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ان میں یہ مزاج پیدا کرنا ہوگا، کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے بہا کر کمائیں اور آدھے پیٹ کھائیں، لیکن دوسروں کے سامنے سوال کے ہاتھ پھیلا کر بے آبروئی کا راستہ اختیار نہ کریں!!

(۲۳/اگست/۲۰۰۲ء)

فضول خرچی ــــــ روز افزوں بیماری

عام طور پر لوگ معاشی قوت کا راز اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو اور اسے دس ہزار کے پندرہ ہزار ملنے لگیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معیشت کے استحکام کا تعلق آمدنی سے بھی ہے اور خرچ سے بھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ مشکل اور اہم خرچ کرنے کا فن ہے، اگر انسان اپنی زندگی کا ایک نظام بنائے اور خرچ میں اپنے آپ کو اس کا پابند رکھے، تو نسبتاً کم آمدنی کے ساتھ بھی وہ اپنے سے زیادہ کمانے والوں کے مقابلہ خوشگوار اور خوش حال زندگی گذار سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن اُمور میں پیسے خرچ کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اس کے چار حصے کرے: بہت ضروری، ضروری، نہ ضروری اور نہ غیر ضروری، غیر ضروری، غور کیا جائے تو انسان ان چاروں مدات سے گذرتا ہے، ''بہت ضروری مصارف'' کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے کھانے پینے کی اتنی مقدار جو آدمی کی بقا کے لئے ضروری ہے، سادگی کے ساتھ علاج و معالجہ، بچوں کی کفایت کے ساتھ تعلیم، فضول خرچی سے بچتے ہوئے شادی بیاہ، یہ انتہائی ضروری اخراجات ہیں، ''ضروری مصارف'' میں مناسب اور طبیعت کے لئے موزوں کھانے پینے کا نظم، بہ قدرِ ضرورت سواری، سہولت بخش علاج، سماجی مزاج سے ہم آہنگ بہ قدرِ ضرورت کپڑے وغیرہ داخل ہیں، ان کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں ''حاجت'' کہتے ہیں، تیسرا درجہ ایسی چیزوں کا ہے جو ضروری نہیں، لیکن انسان مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سہولت کے لئے ان کا طالب ہوتا ہے: جیسے آرام دہ سواری، ایک حد تک راحت بخش علاج وغیرہ، یہ ضروریات نہیں ہیں، البتہ '' جائز خواہشات'' ہیں اور فقہ اسلامی کے ماہرین کی زبان میں ''تحسینات'' ہیں، چوتھا درجہ ایسی چیزوں کا ہے، جو بالکل غیر ضروری اور فضول

ہیں، جیسے مکانات میں حد سے زیادہ تزئین و آرائش، کپڑوں میں بہت قیمتی ملبوسات کا انبار، کھانے پینے میں ایسی فضول خرچی کہ دس آدمی کے کھانے کی جگہ بیس آدمی کا کھانا پک جائے، آدھا استعمال ہو اور آدھا ضائع ہو، شادی بیاہ میں ہزاروں روپے کے کارڈ کی طباعت پر خرچ کر دینا، شادی خانہ کی بہت زیادہ آرائش، دعوت میں کئی طرح کے میٹھے، سواریوں میں ضرورت ایک گاڑی سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن کئی کئی گاڑیوں کا رکھنا اور جب کسی نئے ماڈل کی گاڑی آئے تو بلا ضرورت جدید سے جدید تر کا شوق فرمانا، یہ سب فضول خرچی اور اسراف کے دائرہ میں آتا ہے۔

جو چیزیں بہت ضروری ہیں، ان میں کمی نہیں کی جاسکتی، جو چیزیں ضروری ہیں، زندگی میں سادگی اپنا کر اور اپنے آپ کو سادہ زندگی کا عادی بنا کر اس میں بھی کسی قدر کمی کی جاسکتی ہے، تیسرے درجہ میں جو چیزیں ہیں، ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، زیادہ تر حرص و ہوس اور خواہشات کا لامتناہی سلسلہ آدمی کو نت نئی آسانیوں کا قیدی بنا لیتا ہے اور یہ آسانیاں انسان کو اسراف اور فضول خرچی کی طرف لے جاتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اپنے لئے سادہ زندگی کو پسند فرمایا اور مسلمانوں کو اسی کی ترغیب بھی دی، آپ ﷺ کا مکان، آپ ﷺ کا لباس، کھانا پینا، بستر، رہن سہن، غرض پوری زندگی سادگی اور کفایت شعاری کا نمونہ تھی، خوب سے خوب تر کی خواہش بھی ایک بیماری ہے، بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، قرض خواہوں سے چھپے پھرتے ہیں، صبح و شام قرض خواہ دروازہ پر دستک دیتا ہے، تقاضہ کرتا ہے، صلواتیں سناتا ہے، سر راہ بے آبرو کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی نئی چیز بازار میں آگئی، تو باوجود اس قرض کے وہ اس کے لئے بے قرار سا ہو جاتا ہے، چاہے اس سے اس کے قرض میں کتنا بھی اضافہ ہو جائے؟ گویا یہ ایک نشہ ہے، جو اپنے مخمور کو ہوش کے ناخن نہیں لینے دیتا۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ دنیا ضروریات پوری کرنے کی جگہ ہے اور آخرت خواہشات کی تکمیل کی جگہ، آخرت اسی لئے بنائی گئی ہے، کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی جو چاہے وہ بھرپور طریقہ پر اور فوراً اسے مہیا کر دی جائے ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي

اَنْفُسُكُمْ'' (حم السجدہ: ۳۱) دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں ہے، بلکہ ضروریات پر اکتفا کرنے کی جگہ ہے، یہاں انسان کا اپنی خواہشات کا غلام بن جانا منزل کو بھول کر راستہ کو مقصد بنا لینے کے مترادف ہے، لیکن افسوس کہ انسان اسی کیفیت میں مبتلا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خوب فرمایا کہ قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کے پیٹ کو بھر سکے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ کہاں ضروریات کی حد سے آگے بڑھ کر خواہشات کے دام میں گرفتار ہو چکا ہے اور اپنی زندگی میں سادگی لانے کی کوشش کرے، آپ سادہ زندگی گذار کر اپنے سماج میں زیادہ باعزت رہ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو پُرسکون بھی رکھ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے پاس عمدہ سواری نہ رہے، آپ کے گھر میں دیدہ زیب فرنیچر نہ ہو، لیکن آپ کے دراوزہ پر کوئی قرض وصول کرنے والا دستک نہ دے رہا ہو اور نہ کوئی آپ کے نادہندہ ہونے کی شکایت کرنے والا ہو، تو آپ باعزت طریقہ پر سماج میں زندگی گذار سکیں گے اور آپ ذہنی تناؤ کی کیفیت سے محفوظ رہیں گے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

اخراجات کا وہ طریقہ جسے میں نے ''غیر ضروری اور فضول'' سے تعبیر کیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے گناہ اور ناجائز ہے، قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر فضول خرچی کی ممانعت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسراف نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے: ''لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ'' (الانعام: ۱۴۱) ایک اور موقع پر فضول خرچی سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں ''اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنَ'' (الاسراء: ۲۷) فضول خرچی دو طریقوں پر ہوتی ہے، ایک یہ کہ بے جا مصرف میں پیسے خرچ کئے جائیں، جیسے ضرورت سے زیادہ روشنی میں، آتش بازی میں، گانے بجانے میں، دکھاوے کے اظہار اور زیادہ تشہیر میں، حد یہ ہے کہ بعض لوگ حج کے لئے جانے اور آنے کے موقع سے بھی کثیر رقم خرچ کر کے اخبارات میں مصور اشتہار طبع کراتے ہیں، یہ سب

بے محل خرچ ہیں، جو شرعاً جائز نہیں، بے محل خرچ کرنے کو قرآن نے ''تبذیر'' سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود ﷛ سے منقول ہے کہ تبذیر ناحق اُمور میں خرچ کرنے کا نام ہے، **الانفاق فی غیر حق** (تفسیر ابن کثیر:۳/۳۶) فضول خرچی کی دوسری صورت یہ ہے کہ جن چیزوں میں خرچ کرنا چاہئے، انہیں میں خرچ کیا جائے، لیکن ضرورت سے زیادہ کھانا ایک غیر ضروری چیز ہے، لیکن اسی میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے، لباس و پوشاک دین میں مطلوب ہے، لیکن اسی میں تفاخر آمیز کپڑے بنانا اور ایک جوڑے کی جگہ دس جوڑے کا اہتمام کرنا فضول خرچی ہے اور اسی کو قرآن نے ''اسراف'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام فضول خرچی کو نہایت ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نے ہر باب میں فضول خرچی کو منع کیا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ دنیا میں جو جتنا زیادہ آسودہ ہوکر کھاتا ہوگا، قیامت کے دن وہ اسی قدر بھوکا ہوگا ''**ان اکثر الناس شبعا فی الدنیا اطولهم جوعا یوم القیامة**'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۳۹۴) حضرت انس ﷛ سے روایت ہے کہ جو کچھ طبیعت چاہے اسے کھا گذرنا اسراف ہی کی ایک صورت ہے، ''**ان من السرف ان تاکل کل ما اشتهیت**'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۳۹۵)

آپ ﷺ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا کہ کھاتے ہوئے اگر کوئی لقمہ ہاتھوں سے گر جائے، تو اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے، معمولِ مبارک تھا کہ اگر کوئی ٹکڑا گر جاتا تو اسے اٹھاتے، پونچھتے، پھر اسے تناول فرماتے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۳۹۶) لباس و پوشاک میں بھی آپ ﷺ نے اعتدال اور میانہ روی کی تلقین فرمائی، حضرت عبد اللہ بن عمر ﷛ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے شہرت اور دکھاوے کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت و رسوائی کا لباس پہنائیں گے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۵۳) ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن عمرو ﷛ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو، البتہ فضول خرچی نہ ہو اور تکبر نہ ہو، (ان ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۵۰) اسی لئے آپ ﷺ نے بسیار خوری کو بھی بہت ناپسند فرمایا ہے۔

نہ صرف کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا، بلکہ دینی امور میں بھی آپ ﷺ نے فضول خرچی کو پسند نہیں فرمایا، ثابت بن قیسؓ نامی ایک صحابی نے ایک دن پانچ سو کھجور کے درختوں کے پھل کاٹے اور اسی دن پورے تقسیم کردیئے، اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں رکھا، تو آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور اسی موقع سے حکمِ ربانی نازل ہوا: ولا تسرفوا، (الجامع لاحکام القرآن: ۷/۱۱۰) یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال نہیں فرماتے، غسل ایک ''صاع'' پانی سے کرتے، جو تین لیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے چوتھائی پانی سے وضو فرماتے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نہر کے پاس ہو جب بھی وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال سے گریز کرے اور ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے نہر کے پاس برتن میں پانی لے کر وضو فرمایا اور جو پانی بچ رہا اسے دوبارہ نہر میں ڈال دیا۔ (مجمع الزوائد: ۱/۲۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسراف اور فضول خرچی نے ہمارے سماج کو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا کردیا ہے جس کی سزا معاشرہ کا ہر شخص بھگت رہا ہے، کیوں کہ جب کسی معاشرہ میں فضول خرچی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، تو لوگ خواہی نہ خواہی اس معیار کو پورا کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کتنی بھی مشقت اٹھانی پڑے، فضول خرچی جہاں ایک شخصی مرض ہے، وہیں ایک قومی مرض بھی ہے، غور فرمایئے کہ اس وقت ہندوستان کے ذریعۂ آمدنی میں سب سے بڑا ذریعہ قرض ہے، ملک کی مجموعی آمدنی کا پچیس فیصد قرض سے حاصل ہوتا ہے اور اخراجات کی سب سے بڑی مد بیرونی سود کی ادائیگی ہے، کہ کل بجٹ کا ستائیس فیصد صرف بیرونی سود کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا ہے، عالمی مالیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق اس وقت ہر ہندوستانی بچہ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ دس ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے، ان بڑھتے ہوئے اخراجات کی سب سے بڑی وجہ سرکاری اخراجات میں بڑھتا ہوا اضافہ ہے، ۱۹۹۸ء، ۱۹۹۹ء میں قریب ستائیس لاکھ کروڑ روپے صرف ہندوستانی حکمرانوں کے اخراجات ہیں، ۱۹۹۷ء میں مرکزی انتظامیہ کی تنخواہ اور الاونس کی مد میں تقریباً پینتالیس ہزار کروڑ کا اضافہ ہوا اور ۱۹۹۹ء میں یہ اضافہ کئی چند ہو چکا ہے۔

اسی طرح الیکشن کا معاملہ ہے: تیرہویں لوک سبھا کے انتخاب میں الیکشن کمیشن کا اندازہ ہے کہ ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور سیاسی پارٹیاں بھی اتنی ہی مقدار میں سفید سرمایہ (White Money) خرچ کریں گی، لیکن مبصرین کا اندازہ ہے کہ امیدواروں کی طرف سے جائز و ناجائز رقم ملا کر پچاس ہزار کروڑ سے کم اخراجات نہ ہوں گے، اس طرح اندازہ کیجئے کہ ہمارے ملک کی مقننہ کے بننے میں اور پھر مقننہ کی شاہ خرچی میں قوم کا کتنا کثیر سرمایہ ضائع ہو رہا ہے؟ یہ قومی فضول خرچی کا ایک کھلا ہوا اور سادہ سا حساب ہے، سرکار تو جو فضول خرچی کرتی ہے، وہ کرتی ہی ہے، نجی کمپنیوں کا حال بھی اس سے کچھ کم بُرا نہیں، مثلاً ورلڈ کپ ۱۹۹۹ء میں ملک کی مختلف کمپنیوں نے اس کرکٹ میچ کے اشتہار اور اس اشتہار کے پسِ پردہ اپنی تشہیر پر نو سو کروڑ روپے خرچ کئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف شخصی اور انفرادی بلکہ قومی اور اجتماعی سطح پر بھی فضول خرچی کی بیماری کس قدر روز افزوں ہے؟ ایک ایسا ملک جو تعلیم اور صحت جیسی اہم ضروریات پر اپنے بجٹ کا دس فیصد بھی خرچ کرنے کے موقف میں نہ ہو اور ایک ایسا ملک جس میں کروڑوں انسان خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرتے ہوں، ہزاروں افراد کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ہو، ایک وقت کھانے کے بعد دوسرے وقت کھانے کا انتظام نہ ہو اور جو قوم اپنے ہزاروں کم عمر اور معصوم بچوں کو ہوٹلوں میں برتن دھونے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو، کیا اُسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پانی بلکہ گندے اور آلودہ پانی کی طرح پیسے بہائیں؟؟

(۲۰ راگست ۱۹۹۹ء)

اپنے روپئے آپ نہ جلائیے!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اکثر نعمتوں کو متضاد صفتوں کا حامل بنایا ہے، ''ہوا'' انسان کے لئے ہمہ وقتی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کرلے، تو پُر رونق آبادیوں کو تاخت وتاراج کرکے چھوڑ دیتی ہے، پانی انسان کے لئے کتنی عظیم الشان نعمت ہے، لیکن یہی پانی جب سیل رواں بن کر کھیتوں کو اجاڑتا، درختوں کو اکھاڑ پھینکتا اور مکانوں کو غرقاب کرتے ہوئے زمین بوس کرتا چلا جاتا ہے، تو ایسی آفت بن جاتا ہے کہ کیا انسان اور کیا حیوان، سب جائے پناہ ڈھونڈتے رہتے ہیں، اور کتنے ہی انسان سیلاب کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اسی طرح آگ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، گو آگ کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے، اور اس کی جلانے اور خاکستر کردینے کی صلاحیت سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، لیکن غور کیا جائے تو انسان کے بے شمار مفادات آگ سے متعلق ہیں، یہ آگ ہی ہے جو نوع بہ نوع خوش ذائقہ غذائیں ہمارے لئے فراہم کرتی ہیں، آج جتنے کارخانے چل رہے ہیں، اور ایک سے ایک سہولت کی اشیاء ہمیں فراہم کررہے ہیں، یہ سب آگ ہی کی کرشمہ سازی ہے، آگ سے بھاپ تیار ہوتا ہے، اور بھاپ سے مشینیں چلتی ہیں، لیکن قدرت کی دوسری نعمتوں کی طرح یہ نعمت بھی کبھی رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے، اگر کسی آبادی میں آتش فشاں پھوٹ جائے، تو انسان اور حیوان کیا، پہاڑ کی چٹانیں بھی سوکھے ہوئے پتوں کی طرح فضاء میں بکھر جاتی ہیں، اور کسی آبادی میں آگ لگ جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے پوری آبادی خاک بلکہ خاکستر کا ڈھیر ہوکر رہ جاتی ہے۔

یہ تو قدرتی آفات ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے آپ آگ کو ایک آفت بنالے، تو

اس سے زیادہ بے وقوف اور بدنصیب اور کون ہوگا؟ بعض لوگ تو غصہ یا مایوسی کی وجہ سے خودسوزی کر لیتے ہیں، دنیا میں بھی ان کی موت بڑی کربناک ہوتی ہے، اور آخرت میں خودکشی کا گناہ اس کے علاوہ ہے، جان کی طرح مال بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، مال نہ صرف دنیا میں انسان کے جینے کا سہارا اور اس کے بقاء کا ناگزیر ذریعہ ہے، بلکہ آخرت میں بھی اجر وثواب اور گناہوں کی تلافی کا باعث ہے، بہت سی عبادتیں جو فرض کی گئی ہیں، خالصاً مالی ہیں، صدقہ صرف عبادت ہی نہیں، بلکہ گناہ کے لئے کفارہ بھی ہے، مال ہی کے ذریعہ بہت سے حقوق وواجبات ادا ہوتے ہیں، جن کا ادا کرنا باعثِ ثواب اور جن سے غفلت برتنا باعثِ گناہ ہے۔

خودسوزی کے تو بہت سے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن مال سوزی اور اپنا مال آپ جلانے کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اپنا مال آپ جلالے تو لوگ اسے پاگل اور دیوانہ ہی سمجھیں گے، لیکن مال سوزی کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں جو ہیں، تو پاگل پن ہی، لیکن معاشرہ انہیں پاگل نہیں کہتا، شادیوں میں جو پٹاخہ بازیاں ہوتی ہیں، کیا یہ اپنے پیسوں کو آپ جلانا نہیں ہے؟ شبِ براءت ایک مبارک رات ہے، عبادت اور ذکر وتلاوت کی رات ہے، لیکن کیا مسلمان محلوں میں یہ رات پٹاخوں کی گھن گرج اور آتش بازیوں کی خیرہ کردینے والی روشنیوں سے پہچانی جاتی ہے؟ ہندو بھائیوں کا ایک تیوہار دیپاولی ہے، پہلے اس رات تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے، اس سے نہ گھر میں آگ لگتی تھی، نہ کسی کی جان کو خطرہ ہوتا تھا، نہ کمزوردل مریض کو کان پھاڑنے والی آواز سے گھبراہٹ ہوتی تھی، لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ نئی نسلوں نے تہوار منانے کے انداز بھی بدل لئے ہیں، اب مٹی کے دیوں کی جگہ بجلی کے بلب اور قمقموں نے لے لی ہے، اور آتش بازیاں اس جوش وخروش کے ساتھ ہوتی ہیں، کہ گویا آگ کا کھیل ہے، کہ کون کتنے روپے آگ میں جھونک سکتا ہے؟ ہمارے مسلمان بھائیوں کو یہ تو توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے دُکھ درد میں شریک ہوں، بھوکے ہوں تو انہیں کھانا کھلائیں، کپڑے نہ ہوں تو انہیں کپڑے پہنائیں، مریض ہوں تو ان کی عیادت کریں، لیکن دیوالی کے اس

نامعقول جوش وخروش اور آتش بازی میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، یعنی اجرو ثواب کے کام میں تو دوری اختیار کرتے ہیں، اور بارگناہ اٹھانے میں شریک وسہیم ہو جاتے ہیں۔

پٹاخہ اور آتش بازی بہ یک وقت کئی گناہوں کو شامل ہے، سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کہ یہ مال کا ضیاع ہے، آدمی اپنی ہر خواہش پوری کرنے لگے اور اس کے فوائد ونقصانات کو اپنے سامنے نہ رکھے، یہ بھی فضول خرچی میں داخل ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ہر من چاہی چیز کھاہی کر دم لے، یہ بھی فضول خرچی ہے، **ان من السرف ان تاكل كل ما اشتهيت** (کنز العمال، حدیث:۷۳۶۶) کھانا پینا اور لباس جو ایک ضرورت ہے، اس میں بھی آپ ﷺ نے اسراف کو پسند نہیں فرمایا، **كلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا مالم يخالطه اسراف او مخلية** (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۳۶۵۰)

اسلام میں فضول خرچی کی ممانعت کے بارے میں احکام اس قدر سخت ہیں کہ وضوء جو ایک عبادت ہے، اور اس پر رسول اللہ ﷺ نے اجر وثواب بتایا ہے، اس میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کو آپ ﷺ نے منع فرمایا، اور اسی بنیاد پر فقہاء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ وضوء ایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے کیا کرتے تھے، ایک صاع کا وزن ساڑھے تین کیلو ہوتا ہے اور ''مُد'' اس کا چوتھائی، اس سے آپ ﷺ کی کفایت شعاری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے آتش بازی کی وجہ سے لوگوں کا آرام وسکون غارت ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کو دقت پیش آتی ہے، بلکہ کئی ایسے واقعات پیش آئے ہیں، کہ لوگوں کی جانیں تک چلی گئیں، یا بعض گھروں کو آگ لگ گئی، دوسروں کی ایذاءرسانی حرام اور گناہ شدید ہے، رسول اللہ ﷺ کو جب کسی گھر پر دستک دینا ہوتا تو ہتھیلیوں کے بجائے انگلیوں کے پورے دستک دیتے، تاکہ بے ہنگم اور غیر متوازن آواز نہ ہو، آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی ہتھیار لہرائے، کہ اس سے لوگوں کی ہراسانی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ آتش بازی اور پٹاخہ بازی میں ایذاءرسانی بھی ہے اور ہراسانی بھی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کریں، اور ان کے طور وطریق کو اپنائیں، خاص کر مذہبی معاملات میں دوسری اقوام کی مماثلت اختیار کرنا زیادہ باعثِ گناہ ہے، خوشی کے موقع پر اس طرح کی حرکتیں کرنا ہندو بھائیوں کی مشابہت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی قوم کا تشبہ اختیار کرے وہ اسی میں سے ہے، **من تشبہ بقوم فھو منھم**، مذہبی اُمور میں مشابہت کی ممانعت نسبتاً زیادہ ہے، بلکہ علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

جو فعل خود گناہ ہو، اس میں تعاون بھی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہیں کرنا چاہئے "**لا تعاونوا علی الاثم و العدوان**" (المائدۃ:۲) اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف خود پٹاخہ بازی کرنا ممنوع ہے، بلکہ دوسروں کو پٹاخہ فراہم کرنا یا اس کی دکانیں لگانا اور اس کو فروخت کرنا بھی اس دائرہ میں آتا ہے، کیونکہ یہ سب گناہ کے تعاون میں شامل ہے۔

پھر مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکر ہے کہ آپ ﷺ کا قبلۂ اول یہودیوں کے غاصبانہ تسلط میں ہے، آپ کی مسجدیں شہید کر دی گئی ہیں، بوسنیا اور چیچنیا کی سرزمین آپ کے بھائیوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، گجرات کا لہو ابھی خشک بھی نہیں ہو پایا ہے، کیسی کیسی ذلت ونکبت اور پسپائی وندامت ہماری تقدیر کا حصہ بنی ہوئی ہیں، ان حالات میں بھی اگر آپ خوشی کے شادیانے بجائیں، اور اظہارِ مسرت کے لئے آتش بازیاں کریں تو کیا ہم سے زیادہ بے حس اور بے شرم انسانیت کا کوئی اور گروہ ہوگا؟؟

(اکتوبر ۲۰۰۲ء)

رشوت ــــ بڑھتا ہوا ناسور!

آج کل عہدے اور مناصب باعثِ اعزاز اور ذرائع کسب سمجھے جاتے ہیں، لیکن دراصل عہدہ داروں اور ذمہ داروں کی جواب دہی عام لوگوں کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے، وہ اپنے بارے میں بھی جواب دہ ہوتا ہے، اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں بھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته** ،یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے، اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں، وہ ان کے بارے میں جواب دہ بھی ہے، اس لئے جو لوگ کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں، اور کوئی منصب ان سے متعلق ہو، ان کی زندگی کو زیادہ محتاط اور ان کے دامنِ عمل کو زیادہ پاک وصاف ہونا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سرکاری محصلین کو دیئے جانے والے ہدیہ کو مالِ حرام قرار دیا، **ھدایا العمال غلول** (مجمع الزوائد: ۴/۲۰۰)

اسی بناء پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا جائے یا کسی اور سرکاری عہدہ پر فائز کیا جائے، تو اسے ایسے لوگوں سے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، جو اس سے پہلے اسے تحائف پیش نہیں کیا کرتے تھے، یا پہلے کم یا معمولی تحفے دیتے تھے، اور اب ان کے تحائف کی مقدار اور معیار میں اضافہ ہو گیا ہو، کیونکہ تحفہ اپنے مقصد و منشا کے اعتبار سے رشوت ہوا کرتا ہے، اور اس طرح خوبصورت ناموں کا غلاف چڑھا کر ایک ناپاک اور خبیث شئی کالین دین عمل میں آتا ہے، رسول اللہ ﷺ جو بحیثیتِ پیغمبر، انسانی نفسیات سے سب سے زیادہ باخبر اور حقیقت آگاہ تھے، آپ نے نہایت دقتِ نظر سے اس چھپی ہوئی انسانی بیماری کو شناخت فرمایا، اور اس کے سدِ باب کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ سرکاری عہدیدار رہتے ہوئے لوگ اسے جو کچھ دیں، وہ اسے بیت المال میں داخل کر دے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ابنِ اُمیہ، نامی قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو وصولی زکوۃ پر عامل بنایا، جب وہ صاحب واپس آئے، تو عرض کیا کہ میں یہ آپ ﷺ کا ہے، اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ کیا ہے، ھذا لکم و ھذا اھدی لی ، آپ کو اس سے بہت ناگواری ہوئی، منبر اقدس پر کھڑے ہوئے، اور لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے ہیں، تو یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ آنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے، کہ اسے ھدیہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟ (بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۷۴) ایک موقع پر خاص اہتمام سے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص میری جانب سے خدمت پر مامور ہو، اور وہ ہم سے ایک دھاگہ بھی چھپائے، تو وہ حرام ہے، جسے وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۸۱)

گویا حکمرانوں، ذمہ داروں اور عہدیداروں کو مال کے معاملہ میں زیادہ محتاط کردار ادا کرنا ہے، کیونکہ کسی عہدہ پر فائز کیا جانا اس پر کامل درجہ اعتماد اور اس کی دیانت پر پورے بھروسہ کی دلیل ہے۔ اگر وہی بے راہ روی کی راہ اختیار کر لے، اور خیانت کا ارتکاب کر بیٹھے، تو دوسروں پر کیا اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس احتیاط کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی سرمایہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ پوری قوم کے مفادات کا محافظ اور چوکیدار ہوتا ہے اور اس پر جرم کرنے اور دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور اسلام کی ان تعلیمات کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایوان اقتدار میں رشوت ستانی اور حریص سیاست دانوں کی قوم سے غداری کے واقعات منظرِ عام پر آتے ہیں۔

موجودہ بی جے پی حکومت اسی دعوے کے ساتھ بام اقتدار پر چڑھی ہے کہ وہ ایک صاف شفاف اور مالی خیانت سے پاک حکومت فراہم کرے گی، کانگریس کو وہ ہمیشہ صلواتیں سناتی رہی ہے، اور بوفورس جیسی قد آور اور ہنگامہ خیز توپ پر بیٹھ کر اس نے اقتدار کا یہ سفر طے کیا ہے، اور اس توپ سے کانگریس کے قلعہ کو مسمار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، لیکن افسوس اور صد ہزار بار افسوس! کہ کانگریس تقریباً چالیس سال کے سیاسی سفر کے

بعد اسکینڈلوں کے جس غار میں جا گری تھی، بے جے پی کے اقتدار کو تو ابھی چالیس مہینے بھی نہیں ہوئے، لیکن اس نے بدعنوانی اور قوم سے خیانت میں اس پر بھی سبقت حاصل کر لی ہے، گویا اقتدار میں سبقت کے ساتھ اخلاقی انحطاط میں بھی ہماری حکومت مسلسل سبقت حاصل کر رہی ہے، اور یہ خیانت بھی دفاع جیسے اہم معاملے میں کی گئی ہے، جس سے ملک کی سالمیت اور اس کے وقار کا تحفظ متعلق ہوتا ہے، پارٹی صدر جناب بنگارو لکشمن سے لے کر بی، جے، پی کی سب سے اہم حلیف سمتا پارٹی کے صدر جیا جیٹلی، ملک سے وفاداری کے دعویدار آر ایس، ایس کے لیڈر جناب گپتا، کئی فوجی جرنیل، اور کئی صف اوّل کے سیاسی قائدین اور دفاعی عہدیداران رشوت کے اس شرم ناک کیس میں ملوث پائے گئے ہیں، جب اتنی ذمہ دار شخصیتیں اور اتنے اہم معاملہ میں خیانت اور بددیانتی کا ثبوت دے سکتے ہیں، تو اوروں کا کیا شمار؟؟

کہا جاتا ہے کہ حکمرانوں کے مزاج واخلاق کا اثر ان کے زیرِ حکومت رہنے والوں پر پڑتا ہے، الناس علی دین ملوکھم: ہمارے ملک میں اس وقت قدم قدم پر رشوت ستانی کا بازار جس طرح گرم ہے، وہ اس کی ایک روشن مثال ہے، آپ راستہ سے گذر رہے ہیں، تو ٹریفک پولیس کو ''معمول'' دینا ہے، اگر کوئی معاملہ خدانخواستہ پولیس اسٹیشن کا پیش آگیا، تو ظالم کو سزا سے بچنے کے لئے اور مظلوم کو اپنی فریاد باقی رکھنے کے لئے معمول دینا ضروری ہے، اگر آپ کی تجارت یا صنعت ہو تو ''معمولات'' کی ضرورت پڑے گی، کچھ پولیس والے، کچھ ٹیکس والے، کچھ یہ آفیسر، کچھ وہ آفیسر، زمین و جائداد کا مسئلہ ہے تو رجسٹری آفس کے کلرکوں اور ذمہ داروں کو معمول ادا کیجئے، اگر ٹرین میں آپ کا ریزرویشن کنفرم نہیں، تو وہاں ٹی ٹی آپ سے معمول مانگنے میں کوئی خجالت محسوس نہیں کریں گے، سیاست دانوں کا معاملہ ان سب سے سوا ہے، انہی عوام سے ان کے کاموں کے لئے بھی رشوت چاہئے اور جو سرکاری کام ان کی معرفت ہوتا ہے، ان میں بھی کمیشن چاہئے، ان کو تو اس آمدنی کے بغیر شاید کھانا بھی ہضم نہ ہوتا ہو اور نیند بھی نہ آتی ہو، غرض، رشوت کا ایک زنجیری سلسلہ ہے، جس نے نیچے سے اوپر تک پورے سماج کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا

ہے، چونکہ اس حمام میں سب بے لباس ہیں، اس لئے گو رشوت کا لین دین دو پہر کی دھوپ کی طرح معلوم ومعروف ہے، لیکن مشکل ہی سے قانون کا شکنجہ انہیں کس پاتا ہے، کیونکہ یہ آپس میں بانٹ کر کھانے والے چور ہیں، اور وہ ایک دوسرے کو بچانے میں ہی اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں، حد یہ ہے کہ انسداد رشوت کے ذمہ داران بھی بعض دفعہ رشوت لینے کے مجرم پائے گئے ہیں، اس لئے رشوت جو کبھی چھپ چھپا کر لی جاتی تھی، لوگ شرماتے اور گھبراتے تھے، کہ کہیں ان کی یہ کمزوری طشت از بام نہ ہو جائے، اب لوگ اسے کوئی قابلِ شرم بات نہیں سمجھتے ہیں، اور اس خلاف معمول کا نام ہی ''معمول'' پڑ گیا ہے، گویا یہ سماجی زندگی کے معمولات میں سے ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان اور رذیل سمجھے جانے والوں کے ساتھ شرفاء قوم بھی بے تکلف اس برائی میں مبتلا ہیں، اب صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں سے ان کی آمدنی دریافت کی جائے تو کہتے ہیں کہ تنخواہ اتنی ہے، اور بالائی آمدنی اتنی، یا باہر کی آمدنی اتنی، یہ بھی بے حیائی اور بے شرمی کی انتہاء ہے، کہ مجرم اپنے جرم کے اظہار میں بھی کوئی حیاء محسوس نہ کریں، اور اپنی حرام خوری پر بھی اس قدر نازاں ہوں کہ اس رذیل اور خبیث آمدنی کو بالائی آمدنی کا نام دیں، رسول اللہ ﷺ نے جن برائیوں پر لعنت فرمائی ہے، ان میں ایک رشوت کا لین دین بھی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، (ابوداؤد: ۳۵۸۰، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۳۴) اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رشوت کے معاملہ میں جو بچولیا ہو یعنی جس نے دینے والے اور لینے والے کے درمیان واسطہ کا کام کیا ہے، اس پر بھی لعنت ہو، **لعن رسول الله ﷺ علی الراشي والمرتشي والرائش** (مجمع الزوائد: ۱۹۸/۴) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رشوت لینے والا اور دینے والا جہنمی ہے **الراشي والمرتشي في النار** (مجمع الزوائد: ۱۹۹/۴) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ فیصلہ میں رشوت کا لین دین تو کفر ہے۔ اور لوگوں کے درمیان رشوت ستانی ''سحت'' یعنی حرام کا کمانا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ اوپر کی آمدنی کے بغیر زندگی گذر ہی نہیں سکتی، لیکن یہ محض اپنے آپ اور اپنے خدا کے ساتھ دھوکہ ہے، بہت سے لوگوں کی آمدنی آپ سے کہیں معمولی اور حقیر ہے، لیکن انہوں نے اپنا دامن حرام سے بچا رکھا ہے، اگر کوئی اور مثال ملنی دشوار ہو تو ان مولویوں ہی کو دیکھ لیا جائے، جو مساجد اور مدارس میں مصروف خدمت ہیں، اور جن کو بہت سے لوگ نشۂ دولت میں مخمور ہو کر اپنی کم نگاہی کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں، ان کی آمدنی کس قدر کم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ حلال پر قناعت کے ساتھ خوش پوشی اور بے فکری کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

دراصل مالِ حلال میں برکت ہوتی ہے، اور مالِ حرام میں بے برکتی، برکت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہزار روپے بارہ سو روپے بن جائیں، اور نہ بے برکتی کا یہ مطلب ہے کہ بارہ سو کے ایک ہزار ہو جائیں، برکت یہ ہے کہ جو کام دوسروں کا زیادہ پیسوں میں ہو، آپ کا وہی کام کم پیسوں میں ہو جائے، اور جن اخراجات طلب مصیبتوں میں دوسرا شخص مبتلا کیا جائے، اللہ آپ کو ان سے محفوظ رکھے، یہ برکت اور بے برکتی محض فلسفہ اور خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے انسان ہر دن سر کی آنکھوں سے دیکھتا اور عملی زندگی میں اس کا تجربہ کرتا ہے، دو شخص بیمار ہوئے، بیماری ایک ہی ہے، لیکن ایک کا علاج پچاس، سو روپے میں ہو گیا، اور دوسرے کے علاج میں ہزاروں روپے خرچ ہو گئے، ایک نے اپنی لڑکی کی شادی کی، تو لاکھوں خرچ ہو گئے، اور اس کے بھائی یا اس کے پڑوسی نے اپنی لڑکی کے لئے اسی معیار کا رشتہ کیا، اور دس ہزار میں پوری تقریب انجام پا گئی، اسی کا نام برکت ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہر شخص اپنے ماحول میں دیکھ سکتا ہے، بس، چشم بینا کی ضرورت ہے، اس طرح کے واقعات محض بخت واتفاق نہیں، بلکہ اللہ کے نظامِ غیبی کے تابع ہیں،

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ جب سارا زمانہ اس برائی میں ملوث ہے تو ایک ہمارے احتیاط کرنے سے کیا انقلاب آجائے گا؟ یہ محض "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" ہے، اگر کسی انسان کے جسم میں دس زخم ہوں، تو کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ جسم کا جو تھوڑا حصہ باقی

ہے، اسے بھی زخمی کر دیا جائے اگر کوئی خوشحال جھونپڑ پٹی میں تنگ دستوں کے درمیان پہنچ جائے، تو کیا یہ خیال آتا ہے کہ جب اتنے سارے لوگ غریب ہیں، تو میں بھی غریب ہو جاؤں اور اپنی دولت سمندر میں ڈال آؤں، یا لوگوں میں لٹا دوں؟؟ ___ جو چیزیں مادی اعتبار سے کراہت و ناپسندیدگی کی ہیں، ان کے بارے میں ہماری سوچ یہ نہیں ہوتی، تو روحانی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات و منہیات میں ہم کیسے ایسے خیال خام کو دخل دے سکتے ہیں، اور کیا خدائے سمیع و بصیر جو دلوں کے حال سے واقف ہے۔ ہمارے اس عذر کو قبول کرلے گا؟

رشوت دراصل غریبوں، مظلوموں اور مجبوروں کا خون ہے، جسے رشوت خور پی کر لذت کام و دہن حاصل کرتے ہیں، یہ خون بہ ظاہر لذیذ اور لطف انگیز ہے، لیکن اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے دنیا میں آفتوں اور ابتلاؤں کو دعوت دیتا ہے، اور آخرت میں عذاب الیم ہے!

(۱۳/ مارچ/ ۲۰۰۱ء)

رشوت اور ہمارا سماج

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، انسان یکا وتنہا نہیں رہ سکتے، انسانی آبادی ہی کے ذریعے اس کی ضروریات پایہ تکمیل کو پہونچ سکتی ہیں، اگر انسان کو خوبصورت سے خوبصورت بہشت صفت پارک میں بھی رکھ دیا جائے، اور اس کے گرد و پیش دودھ اور شہد کی نہریں بھی جاری ہو جائیں، لیکن وہ ویران اور غیر آباد ہو تو انسان جلد ہی اس خطۂ عشرت سے اکتا جائے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی حضرت حوا کو حضرت آدم کا رفیق و شریک بنایا اور دنیا میں نسل انسانی کے ہر فرد کو ایک پورے خاندان کی رفاقت عطا کی، جب ایک ہی جنس کے مختلف افراد جمع ہوں، تو ضروری ہے کہ ان کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یہ ٹکراؤ تین طرح کا ردعمل پیدا کرتا ہے، عدل، ایثار اور ظلم۔

عدل یہ ہے کہ ہر شخص قانون واصول کے مطابق اپنے حق پر راضی اور قانع رہے، اگر تمام لوگ طے کرلیں کہ وہ اپنے حق پر ہی اکتفاء کریں گے، تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان کوئی ٹکرواؤ نہیں پیدا ہوگا، جب ایک شخص اپنے حقوق کے دائرہ سے متجاوز ہو تو یا تو دوسرا فریق اپنے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جائے گا، یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا وصف ہے، اسی کا نام ایثار ہے، قرآن و حدیث میں اس وصف کی بڑی تحسین کی گئی ہے، ایثار تصادم کو ختم کرنے کا بہت ہی شریفانہ طریقہ ہے، لیکن نفس کے لئے اس قدر دشوار اور مشکل بھی ہے، اور بعض معاملات تو ایسے ہیں کہ ان میں ایثار کی گنجائش بھی نہیں ہے، اگر دوسرا فریق ایثار کے لئے تیار نہ ہو، تو جو لوگ خدا ناترس ہوتے ہیں، وہ آمادۂ ظلم ہو جاتے ہیں اور دوسرے کا حق چھین لینے کی سعی نامسعود شروع کر دیتے ہیں، ظلم کے لئے جو اسباب اور وسائل اختیار کئے جاتے ہیں ان میں ایک اہم ذریعہ رشوت بھی ہے۔

کسی کو حق سے محروم کرنے یا کسی ناحق کو اپنے حق میں کرنے کے لئے جو پیسے یا کوئی اور چیزیں دی جائیں، اسی کو رشوت کہتے ہیں، **ما یعطی لابطال حق او لا حقاق باطل** (طحطاوی علی الدر: ۳/۱۷۷)___ رشوت کے لئے صرف مال ہی کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات دوسرے مالی یا غیر مالی فوائد پہونچا کر بھی اپنے غلط مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے، یہ بھی رشوت ہی میں داخل ہے، رشوت معاشرہ میں ظلم و ناانصافی کو تقویت پہونچاتی ہے، رشوت کی وجہ سے باصلاحیت لوگ محروم کردیئے جاتے ہیں، اور بے صلاحیت اور نااہل لوگ ذمہ دار بنائے جاتے ہیں، اور اس سے پورے سماج کو نقصان پہونچتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک طالب علم نے نااہلی کے باوجود رشوت دے کر ٹسٹ پاس کیا اور شعبۂ طب میں داخلہ لے لیا، پھر اسی طرح میڈیکل تعلیم مکمل کی، اس کے بعد اسی سہارے ملازمت حاصل کی، اور ترقی کی منزلیں طے کی، اب یہ نااہل کتنے مریضوں کو صحت کے بجائے موت سے ہم کنار کرے گی، اس نقصان کا اصل سرا رشوت ہی سے ملتا ہے، آج کل تو دفاع جیسے حساس اور اہم شعبہ میں بھی رشوت کا بازار گرم ہوگیا ہے، جس کے نقصان کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، دفاع سے ملک کی سلامتی اور اس کا تحفظ متعلق ہے، اگر رشوت کی بنیاد پر غیر مفید ہتھیار خریدے گئے، تو خطرات کے مواقع پر کیسے ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کرسکیں گے، اس لئے رشوت افراد و اشخاص، معاشرہ و سماج اور قوم و ملک ہر ایک کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور خطرناک عمل ہے۔

شاید ہی کوئی شخص ہو، جو رشوت کی برائی کا معترف نہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہماری زندگی کا کوئی شعبہ رشوت ستانی سے خالی نہیں، اس نے باصلاحیت لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کریں، ہنر سیکھیں اور اپنی قوم کو چھوڑ دوسرے ملکوں میں جاکر لوگوں کی خدمت کریں، اور کسی بھی شعبہ میں بے صلاحیت اور کم صلاحیت عہدہ داران اور کارکنان کی بھرمار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ سرکاری اسکولوں اور ہسپتالوں وغیرہ سے مایوس ہوگئے ہیں، اور کارکنوں کی نااہلی اور فرض ناشناسی کی وجہ سے دنوں میں ہونے والے کام مہینوں میں بھی انجام نہیں پاتے۔

رشوت کو کسی بھی مذہب میں پسند نہیں کیا گیا ہے، اسلام کی نگاہ میں رشوت نہایت ہی قابلِ نفرت عمل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اپنے مال آپس میں باطل طریقہ پر نہ کھاؤ اور مال حکام کے پاس نہ لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم اس سے واقف ہو (البقرۃ:۱۸۸)

اس آیت میں خاص طور پر عدالت کی رشوت ستانی کی مذمت فرمائی گئی ہے، کیوں کہ عدالت کا کام ہی انصاف قائم کرنا اور ظلم کو روکنا ہے، اگر یہ ادارۂ انصاف خود رشوت کی بنیاد پر ظلم و ناانصافی پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہوگی، نمک اس لئے ہے کہ کھانے کے ذائقہ کو درست کرے، لیکن اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو اس کا مداوا کیوں کر ہو سکے گا؟ شکر اس لئے ہے کہ بے مزہ چیزوں کو حلاوت بخشے، لیکن اگر شکر ہی میں حلاوت باقی نہ رہے، تو کہاں سے مٹھاس حاصل ہوگی؟ یہی حال عدالت اور انصاف کے اداروں کا ہے، اس لئے سب سے زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ترین صورت محکمۂ انصاف کا رشوت میں مبتلا ہونا، یا اس کو رشوت میں مبتلا رکرنا ہے، ایک شخص وقتی طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن مآل کار یہی چیز خود اس کے لئے بھی موجب نقصان ہو سکتی ہے، کیوں کہ جو شخص آج اس سے رشوت لے کر اپنے عہدہ کو بے آبرو کر سکتا ہے، وہ کل ہو کر اس کے خلاف دوسروں سے بھی رشوتیں وصول کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے رشوت کی دوسری جس بدترین صورت کا ذکر کیا ہے وہ ہے، دین و ایمان کے معاملہ میں رشوت، بہت سے یہودی اور نصرانی علماء اپنے خوش عقیدہ عوام سے نذر و نیاز وصول کیا کرتے تھے، اور دین کے بارے میں انہیں دھوکہ میں رکھتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ ہوئی، تو یہی لوگ اپنی عوام کو دامن اسلام میں آنے سے رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ مسلمان نہ ہونے پائیں، تاکہ ان کی اس حرام خوری میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدنیتی سے پردہ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو! بہت سے یہودی اور عیسائی علماء ناحق طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنائیے (التوبہ: ۳۴)

مذہب کی راہ سے جو رشوت آتی ہے، وہ تقدس کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہے، لوگوں کو اس کے رشوت ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا، اس مذہبی رشوت کی حقیقت جاننے کے لئے کلیساؤں کی تاریخ پڑھئے، جہاں مغفرت نامے فروخت کئے جاتے تھے، اور پادری حضرات ورثاء کے داد و دہش کے اعتبار سے میت کا درجہ و مقام متعین کر کے دستاویز بھی لکھ دیتے تھے، اسی کیفیت نے یورپ میں کلیسا کے خلاف بغاوت پیدا کی اور بالآخر یہ عیسائیت کے بجائے نفسِ مذہب سے نفرت کا باعث ہوا، مدینہ میں علماء یہود حلال و حرام کے احکام متعین کرنے میں بھی رشوت لیا کرتے تھے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ مفتی پر حسب خواہ فتویٰ لکھنے کے لئے پیسے قبول کرنا بھی حرام ہے، اور یہ بھی رشوت میں داخل ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ مستفتی سے کسی قسم کا تحفہ قبول ہی نہ کیا جائے، بعض فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

مذہبی رشوت کی روایت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے، قادیانی حضرات کے یہاں آج بھی بہشتی مقبرہ، قادیان میں اصل اور دوسرے مقامات پر اس کی نقل کی شکل میں موجود ہیں، جس میں کثیر رقم لے کر تدفین کی اجازت دی جاتی ہے، اور لوگ اس تصور کے ساتھ اس میں دفن ہوتے ہیں کہ یہاں دفن ہوتے ہی اب وہ داخل بہشت ہوں گے، اسی تصور کے تحت دور دراز مرنے والے اپنی جائیداد کا ایک بڑا حصہ دے کر اس قبرستان میں جگہ حاصل کرتے ہیں، یہ مغفرت نامے تقسیم کرنے کی جدید اور مہذب شکل ہے، افسوس کہ اب مسلمانوں میں بھی یہ بیماری در آرہی ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر فلاں بزرگ کی قبر کے قریب دفن ہونے کا موقع مل جائے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا، حالاں کہ انسان کا مسئلہ عقیدہ و عمل اور تعلق مع اللہ سے حل ہوگا، نہ کہ کسی مخصوص جگہ میں دفن ہونے سے، عوام

کی اس خوش عقیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، بہت سی دفعہ متولیاں خطیر رقم حاصل کر کے قبر کی جگہ دیتے ہیں، یہ بالکل خلاف شرع بات ہے، کیوں کہ قبرستان وقف ہے، وقف کی زمین کا کوئی شخص مالک نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُسے خرید و فروخت کیا جا سکتا ہے، یہ غیر شرعی عمل بھی رشوت ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔

رشوت کی ان دو صورتوں کو تو قرآن نے صراحتاً ذکر کیا ہے، لیکن رشوت جس شعبہ میں بھی ہو اس کا محرک کچھ بھی ہو اور کسی نام سے بھی لین دین ہو یہ بہر حال حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

(ترمذی بروایت عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر: ۱۳۳۷)

رشوت لینا تو جرم ہے ہی، لیکن رشوت دینا بھی کچھ کم جرم نہیں، کیوں کہ جب معاشرہ میں رشوت دینے والے لوگ پیدا ہوتے ہیں تبھی رشوت خوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے مرض کو تقویت پہونچتی ہے، حضرت ثوبان ؓ کی ایک روایت میں ''رائش'' کے لفظ کا اضافہ ہے، (مجمع الزوائد: ۱۹۸/۴) رائش ''بچولئے'' کو کہتے ہیں، یعنی جو شخص رشوت خور اور رشوت دہندہ کے درمیان واسطہ کا کردار ادا کرے۔

بحیثیت عہدہ جو فریضہ آپ سے متعلق ہے، اگر اس کے ادا کرنے پر آپ نے پیسے حاصل کئے، خواہ منھ کھول کر مانگا ہو، یا زبان حال کو سمجھتے ہوئے دیا گیا ہو، بہر صورت یہ رشوت میں داخل ہے، رشوت نام بدل کر بھی دی جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عہدہ داروں کو دیا جانے والا تحفہ بھی مال حرام ہے، **هدايا العمال غلول** (مجمع الزوائد: ۲۰۰/۴) ___ بعض لوگ رشوت کے لئے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ سارا ماحول ہی بگڑا ہوا ہے، اور تمام ہی لوگ رشوت خوری کرتے ہیں، یہ نفس کو فریب دینے کا ایک بہانہ ہے، نہ کہ دلیل، اگر کوئی بُرائی اس لئے جائز ٹھہرے کہ بہت سے لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں تو پھر تو کوئی برائی ایسی نہ ہوگی کہ اس کو سندِ جواز حاصل نہ ہو جائے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں اب بھی بہت سے ایسے ایماندار لوگ موجود ہیں، جو رشوت سے اپنا دامن بچاتے ہیں، وہ خوبصورت کوٹھیوں اور فلک بوس در و بام کے مالک

نہیں ہوتے، لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت کے نقوش ثبت ہوتے ہیں ۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب اس بُرائی کے بُرائی ہونے کا احساس بھی ذہنوں سے نکلتا جارہا ہے، لوگ بے تکلف اپنی تنخواہ اور اوپر کی آمدنی کا ذکر کرتے ہیں، اگر کسی لڑکے کے بارے میں یہ بتایا جائے کہ یہ چور اور ڈاکو ہے تو شاید ہی کوئی شخص اس سے رشتہ کرنے کو تیار ہو، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں شخص کی اوپر کی آمدنی اتنی ہے، ماں باپ اس کی ہوش مندی کے ثناء خواں ہوتے ہیں، اور لوگ اپنی لڑکی کے لئے اس مہذب چور بلکہ سینہ زور کا انتخاب کرتے ہیں ، دنیا کے لوگ خواہ بُرائی کے دلدل میں گردن تک ڈوب جائیں، مسلمانوں کے لئے بہر حال یہ بات روا نہیں ہے، کہ وہ '' چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے فلسفہ کو اپنی زندگی کا اصول بنالیں، ان کا کام ہوا کے رُخ پر چلنا نہیں ہے، بلکہ ہوا کے رُخ کو بدلنا اور اس کو صحیح سمت دینا ہے!۔

(۲۹ / مارچ ۲۰۰۲ء)

سود اور ہمارا معاشرہ

اسلام کے نظامِ معیشت کا ایک بنیادی ستون ''سود'' کی ممانعت ہے، یوں تو اسلام سے پہلے بھی اکثر مذاہب میں سود کو منع کیا گیا تھا، بائبل کا عہدِ عتیق جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مستند ہے کے ''خروج'' نامی صحیفہ میں اسرائیلیوں سے سود لینے کو منع کیا گیا ہے، اور عہدِ جدید جو صرف عیسائیوں کے نزدیک معتبر ہے، کے صحیفہ ''لوقا'' کی انجیل میں بھی قرض پر نفع نہ لینے کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ عیسائیت میں اصلاحی تحریک کے بانی لوتھر نے تو اس بات کو بھی شد و مد سے منع کیا اور حرام قرار دیا کہ نقد قیمت کے مقابلہ اُدھار قیمت زیادہ رکھی جائے، فلاسفۂ یونان افلاطون اور ارسطو وغیرہ نے بھی سود کو ایک نامعقول اور ایک ناواجبی فعل قرار دیا ہے، کیوں کہ خود روپیہ میں روپیہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں۔

لیکن اسلام نے جس شدت اور تاکید کے ساتھ اس سے منع کیا ہے کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، قرآن مجید میں کم از کم پانچ آیات میں صراحتاً سود کو منع کیا گیا ہے، اور یہاں تک فرمایا گیا کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ، (البقرۃ: ۲۷۸) احادیث میں بھی بکثرت سود کی مذمت کی گئی ہے، آپ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ کو لکھنے والے، اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والے، سبھوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے، (مسلم، عن جابر بن عبد اللہ) کی ایک روایت میں ہے کہ سود کا وبال تہتر قسم کا ہے، جن میں سے کمتر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے (مستدرک حاکم، عن عبد اللہ ابن مسعود) حضرت عبد اللہ بن سلام نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم تیتیس بار زنا کرنے سے بڑھ کر ہے، (طبرانی) آپ ﷺ کے ارشادات

سے معلوم ہوتا ہے کہ سود ان بُرائیوں میں سے ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب آتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب کسی آبادی میں زنا اور سود کی کثرت ہو جائے تو گویا اس آبادی والوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو اُتار لیا (مستدرک حاکم) اور ایک روایت میں ہے کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو وہ قوم قحط سالی میں مبتلا کردی جاتی ہے (مسند احمد، عن عمرو بن عاص)

بہ ظاہر یوں لگتا ہے کہ سود سے مال بڑھ رہا ہے، لیکن درحقیقت سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں'' (البقرۃ: ۲۷۶) نیز حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے سود سے بہت سارا مال کمایا، انجام کار اس میں کمی ہی ہوگی، (ابن ماجہ) اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سود سے بھی بچو اور شبہہ سود سے بھی بچو، ''دعوا الربوٰ والریبۃ'' (ابن ماجہ) — ایک طرف سود کی اس درجہ ممانعت ہے کہ شاید شرک کے علاوہ کسی اور برائی کو اس درجہ مذمت کی گئی ہو، اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی، (طبرانی، عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نیز ایک روایت میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود خوری سے بچ بھی جائے تو اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا (ابوداؤد، عن ابی ہریرۃ) اور غالباً یہ زمانہ آچکا ہے!

سود کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کا تبادلہ ہو، جیسے روپیہ کا روپیہ سے، سونا کا سونا سے، چاول کا چاول سے، اور ایک طرف سے زیادہ مقدار ہو اور دوسری طرف سے کم، جیسے ایک سو روپیہ دیا جائے اور ایک سو دس وصول کیا جائے، یا ایک سو کیلو چاول دیا جائے اور ایک سو دس کیلو چاول وصول کیا جائے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول مقرر فرمادیا کہ قرض پر قرض دھندہ کا کسی بھی طرح کا نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے: ''**کل قرض جر منفعۃ فھو ربو**'' (الجامع الصغیر، عن علی) صحابہؓ اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ مقروض کا تحفہ بھی قبول کرنے میں احتیاط کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو دس ہزار درہم بہ طورِ قرض دیئے تھے، حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ

نے اپنے باغ کا کچھ پھل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تحفۃً پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا، (بخاری و مسلم) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی کو قرض دو اور وہ تم کو کھانے کا طبق پیش کرے، یا اپنی سواری پر چڑھائے، اور پہلے سے اس طرح کے تحفے تحائف دینے کا اس کا معمول نہ رہا ہو، تو ایسے تحائف قبول نہ کرنا چاہئے، (ابن ماجہ) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا اور اس نے مجھے کچھ تحفہ دیا، تو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا تو اس تحفہ کے بدلہ میں تحفہ دے دو یا اس کو اپنے قرض میں شمار کر لو، (مصنف عبدالرزاق) اس لئے قرض دینے والوں کو اس سلسلہ میں خوب احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

افسوس کہ آج کل سود کی حرمت اور شناعت لوگوں کے ذہن سے نکلتی جا رہی ہے، بہت سے لوگ بات تو جائز اور حلال منافع کی کرتے ہیں، لیکن نقصان کا خطرہ قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ ان کا نفع بہر حال متعین رہے۔ اور سرمایہ کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ یہ فکر سود خوارانہ ذہنیت کی عکاس ہے۔ جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اپنا سرمایہ خوب سوچ سمجھ کر کسی کمپنی میں مشغول کیا جائے اور کمپنی کے کاروبار کی پہلے تحقیق کر لی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان اپنے ذہن کو اس بات کے لئے تیار رکھے کہ اگر اللہ کی طرف سے اس کے لئے نقصان ہی مقدر ہے تو اسے بھی وہ ہنسی خوشی برداشت کرے گا۔

سود کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں، جس میں ناواقفیت کی وجہ سے بعض دیندار لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں ایک صورت تو بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کی ہے، یعنی: آپ ایک مخصوص مدت کے لئے بینک میں اپنی رقم رکھتے ہیں، اور اس مدت کے پوری ہونے پر بینک دوگونہ تین گونہ صورت میں یہ رقم آپ کو واپس کرتا ہے، ظاہر ہے یہ صورت صریحاً سود کے دائرہ میں آتی ہے اللہ تعالیٰ نے مطلقاً سود کو حرام قرار دیا ہے، کسی خاص خطہ اور علاقہ کی قید نہیں لگائی، اس لئے جیسے شراب، زنا، چوری اور ڈکیتی، مسلم ممالک میں بھی حرام ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی، اسی طرح سود کی ممانعت بھی ہر علاقہ اور مقام کے لئے ہے اور

اس سے بچنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

آج کل شہروں میں یہ صورت مروج ہے کہ لوگ اپنا مکان ایک مخصوص مدت کے لئے فروخت کر دیتے ہیں، کہ جب بھی ہم یہ رقم واپس کر دیں، پھر مکان واپس مل جائے، مثلاً ''الف'' نے ''ب'' کے ہاتھ پچاس ہزار میں مکان فروخت کیا کہ جب بھی الف ب کو پچاس ہزار روپیہ ادا کر دے گا ب اس کو اس کا مکان واپس کر دے گا، اس معاملہ میں الفاظ تو خرید و فروخت کے استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور مکان بہ طورِ رھن کے قرض دینے والے کے پاس ہے، رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور قرض پر نفع اٹھانا سود میں داخل ہے، فقہاء کے نزدیک یہی صحیح رائے ہے، اسی طرح دیہاتوں میں مقروض اپنی زراعتی اراضی قرض دھندہ کو حوالہ کرتا ہے کہ جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے قرض دھندہ اس کی پیداوار لیتا رہے، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور اسی کا نام سود ہے۔

بعض ادارے جن کا مقصود غیر سودی قرضوں کی فراہمی ہے وہ دفتری اخراجات اور ادارہ کے انتظامات کے لئے قرض لینے والوں سے کچھ رقم وصول کرتے ہیں، اگر ہر ماہ حساب ہو جائے اور واقعی جتنی رقم قرض کے لین دین کو لکھنے والے عملہ اور قرض وصول کرنے والے عاملین پر خرچ ہوئی ہے، اس کو ان مقروضوں پر ان کے قرض کی نسبت سے تقسیم کر دیا جائے اور ٹھیک اتنا ہی پیسہ وصول کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن مقروضوں پر ان کی رقم کے تناسب سے ماہانہ فیس رکنیت باندھ دینا مثلاً ہزار روپے پر دس روپے ماہانہ یا بیس ہزار پر بیس روپے ماہانہ، تو یہ صورت جائز نہیں ہے اور یہ بھی سود ہی میں داخل ہے، اسی طرح قرض کے تناسب سے قرض فارم فروخت کرنا، مثلاً دس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو سو روپے کا قرض فارم اور بیس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو دو سو روپے کا قرض فارم خریدنے پر مجبور کرنا جائز نہیں، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، جو ادارے قائم ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ لوگوں کو غیر سودی قرضے فراہم کریں ان کے لئے ایسے طریقے

اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں، جو خود بالواسطہ سود کے زمرہ میں آتے ہیں۔

چِٹھی فنڈ کی یہ صورت کہ ماہ بہ ماہ ایک شخص پوری رقم اٹھا لے، اور تمام شرکاء کو باری باری برابر رقم ادا کرنی پڑے، جائز ہے، لیکن یہ صورت کہ بعض شرکاء نقصان کے ساتھ چِٹھی اٹھالیں، جائز نہیں، اور سود میں داخل ہے؛ کیوں کہ یہ رقم کا رقم سے تبادلہ ہے اور بعض شرکاء کو زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے اور بعض کو کم ___ اسی طرح تاجروں کے حلقہ میں چیک، ڈرافٹ اور کسی کے ذمہ واجب الاداء قرض کم قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے تاکہ کم سہی، نقد رقم حاصل ہو جائے، مثلاً دس ہزار کا چیک نو ہزار میں فروخت کر دیا جاتا ہے، یہ صورت بھی سود ہی کی ہے، اور قطعاً جائز نہیں۔

اسی طرح کے بعض اور معاملات بھی ہیں جو سود سے خالی نہیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دنیا حلال وحرام کی پرواہ کئے بغیر جس راستہ پر جارہی ہے ہم بھی وہی راستہ اختیار نہ کرلیں، بلکہ اپنے آپ کو سود جیسے گناہ سے بچائیں، کہ حضرت عبداللہ ابن عباس ﷺ سے روایت ہے: جس کا گوشت مال حرام سے پیدا ہوا ہو، جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔ (مشکوٰۃ:۲۴۶)

(۹/اپریل/۱۹۹۹ء)

منشیات بڑھتا ہوا سماجی ناسور

انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، ان میں ایک عقل و دانائی بھی ہے، یہی عقل ہے جس نے اس کے کمزور ہاتھوں میں پوری کائنات کو مسخر کر رکھا ہے اور اسی صلاحیت کی وجہ سے اللہ نے اس کو دنیا میں خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے، اسی لئے اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید نے بے شمار مواقع پر مسلمانوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، تدبر اور تفکر کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ انسان جن چیزوں کا مشاہدہ کرے اور جو کچھ سنے اور جانے عقل کو استعمال کر کے اس میں غور و فکر کرے، اور انجانی حقیقتوں اور ان دیکھی سچائیوں کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرے، اسی لئے قانونِ اسلامی کے ماہرین اور فلاسفہ نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام بنیادی طور پر پانچ مقاصد پر مبنی ہیں، دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، گویا عقل اور فکر و نظر کی قوت کو برقرار رکھنا اور اسے خلل اور نقصان سے محفوظ رکھنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔

چنانچہ اسلام میں جن کاموں کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور جن سے منع فرمایا گیا ہے ان میں ایک نشہ کا استعمال بھی ہے، قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ اس کو حرام بلکہ ناپاک قرار دیا ہے، کیونکہ انسان کا سب سے اصل جوہر اس کے اخلاق و کردار ہیں نشہ انسان کو اخلاقی پاکیزگی سے محروم کر کے گندے افعال اور ناپاک حرکتوں کا مرتکب کرتی ہے، اور انسان کی روحانی اور باطنی ناپاکی ظاہری ناپاکی سے بھی زیادہ انسان کے لئے مضرت رساں ہے، احادیث میں بھی اس کی بڑی سخت وعید آئی ہے، اور بار بار آپ ﷺ نے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ اس کے

حرام اور گناہ ہونے کو بتایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، (بخاری عن عائشہ، حدیث نمبر: ۵۵۸۵) حضرت جابر بن عبد اللہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جس شئی کی زیادہ مقدار نشہ کا باعث ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۸۶۵) یہ نہایت اہم بات ہے، کیونکہ عام طور پر نشہ کی عادت اسی طرح ہوتی ہے کہ معمولی مقدار سے انسان شروع کرتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ زہر آمیز انجکشن کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوتی۔

نشہ کے جو نقصانات ہیں وہ ظاہر ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان تو خود اس شخص کی صحت کو پہنچتا ہے، اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ شراب اور منشیات ایک سست رفتار زہر ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کے جسم کو کھوکھلا اور عمر کو کم کرتا جاتا ہے، انسان کی زندگی اس کے لئے ایک امانت ہے، انسان کے وجود سے نہ صرف اس کے بلکہ سماج کے بہت سے اور لوگوں کے حقوق بھی متعلق ہیں، نشہ کا استعمال اس امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نشہ آور اشیاء کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو جسم کے لئے ''فتور'' کا باعث بنتی ہوں یعنی ان سے صحت میں خلل واقع ہوتا ہو، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے: **نهى رسول الله عن كل مسكر و مفتر** (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۶۸۶)

منشیات کے نقصانات کا دوسرا پہلو مالی ہے، سیال منشیات ہوں یا جامد، قابلِ لحاظ قیمت کی حامل ہوتی ہیں، شراب کی ایک بوتل اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا ایک کنبہ اس سے اپنی ایک وقت کی روٹی روزی کا سامان کر لیتا ہے، یہ تو معمولی نشہ آور اشیاء کا حال ہے، بعض منشیات تو اتنی قیمتی ہیں کہ ایک کیلو کی قیمت ایک کروڑ روپے ہوتی ہے، ہماری حکومت ایک مہلوک کے لئے ایک لاکھ روپے ایکس گریشیا دیتی ہے، اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کیلو ہیروئن کی قیمت ایک سو انسانوں کے برابر ہے، اس سے ہمارے عہد میں انسانی وجود کی ناقدری اور صحت و

اخلاق کے لئے مخرب اشیاء کی ''قدر و قیمت'' کا تقابل کر سکتے ہیں!

— پھر منشیات کا استعمال تو آدمی اپنے اختیار سے شروع کرتا ہے، لیکن جب وہ گرفتار بلا ہو جاتا ہے تو آپ اپنے قابو میں نہیں رہتا، وہ اضطراراً منشیات کے خریدنے اور استعمال کرنے پر گویا مجبور ہوتا ہے، چاہے کھانے کو دو روٹی میسر نہ ہو، گھر کے لوگ بھوک اور فاقہ سے گذار رہے ہوں، علاج کے لئے پیسے میسر نہ ہوں لیکن جو اس عادت کا اسیر ہو گا، وہ انسانی ضروریات کو پس پشت ڈال کر پہلے اپنی اس خوئے بد کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے اسراف اور فضولی خرچی کا یہ بہت بڑا محرک ہے، نشہ خواری نے خاندان کے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، بڑی بڑی جائدادیں اور پرشکوہ حویلیاں اس خود خرید زہر کے عوض کوڑی کی قیمت بک چکیں۔

منشیات کی مضرتوں کا سماجی پہلو یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے جس سے مختلف لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہیں، ایک شخص باپ ہے تو اسے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، نہ صرف اس کے روز مرہ کی کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، بلکہ اس کی تعلیم کی بھی فکر کرنی ہے، وہ بیٹا ہے تو اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اگر خاندان کے دوسرے بزرگ موجود ہوں تو ان کی پرورش کا بار بھی اٹھانا ہے، شوہر ہے تو یقیناً بیوی کے حقوق اس سے متعلق ہیں، بھائی ہے تو چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور شادی بیاہ کا فریضہ اسی کے کاندھوں پر ہے، نشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور غافل بنا دیتا ہے، اور اس بدمستی میں نہ اس کو لوگوں کے حقوق یاد رہتے ہیں، نہ اپنے فرائض و واجبات، بعض اوقات تو وہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ و برباد کر دے، جیسے طلاق کے واقعات ہیں، طلاق کے بہت سے واقعات بالخصوص دیہی علاقوں میں اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، جس کا خمیازہ اسے بھی بھگتنا پڑتا ہے اور اس سے زیادہ اس کی بیوی اور بچوں کو۔

شراب کے نقصانات کا سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، نشہ کی بدمستی انسان سے ناکردنی کرالیتی ہے، اور ناگفتی کہوا دیتی ہے، قتل، عصمت ریزی، ظلم و زیادتی، سب و شتم

اور ہذیان گوئی باعزت لوگوں کی بے توقیری، کون سی بات ہے جو انسان نشہ کی حالت میں نہ کرتا ہو؟ ہوش کی کیفیت میں جس سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی، نشہ کی حالت میں اس پر ہاتھ اٹھا دینا بھی قابلِ تعجب نہیں، اور معتدل حالت میں تنہائی میں بھی زبان پر جن باتوں کا لانا گراں خاطر ہو، نشہ کی حالت میں اس سے زیادہ فحش اور خباثت آمیز گفتگو انسان بے تکلف کرتا ہے، اسی لئے نشہ صرف برائی ہی نہیں، بلکہ برائیوں کی جڑ ہے، اور محض ایک گناہ ہی نہیں بلکہ سینکڑوں گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے شراب کو ''ام الخبائث'' یعنی برائیوں کی جڑ (نسائی: ۵۶۶۶) اور ''ام الفواحش'' یعنی بے حیائیوں کی جڑ قرار دیا ہے، (ابن ماجہ: ۳۳۷۲) شراب کی اخلاقی قباحتوں کی اس سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی، ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جیسے درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں، اسی طرح شراب سے برائیاں۔

آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ایک خوبصورت عورت نے اپنے پاس شراب رکھی اور ایک بچہ کو رکھا اور ایک شخص کو مجبور کیا کہ وہ تین میں سے ایک برائی کم سے کم ضرور کرے، یا تو وہ اس عورت کے ساتھ بدکاری کرے، یا اس بچہ کو قتل کردے، یا شراب پئے، اس شخص نے سوچا کہ شراب پینا ان تینوں میں کمتر ہے، چنانچہ اس نے شراب پی لی، لیکن اس شراب نے بالآخر یہ دونوں گناہ بھی اس سے کرالئے۔ (نسائی: ۵۶۶۶)

غرض نشہ جسمانی، مالی، سماجی اور اخلاقی ہر پہلو سے انتہائی مضرت رساں چیز ہے، اس وقت نوع بنوع منشیات کی کثرت اور اس کے استعمال میں جو عموم پیدا ہو رہا ہے وہ حد درجہ تشویش ناک بات ہے، لوگوں نے منشیات کو نئے نئے خوبصورت نام دے دئے ہیں، گٹکھے، چاکلیٹ اور مختلف دوسری اشیاء کے ساتھ نشہ کا نام لئے بغیر تھوڑا تھوڑا نشہ آور اجزاء کا طلبہ اور نوجوانوں کو عادی بنایا جاتا ہے، اور یہی چیز اس کو آئندہ منشیات کا باضابطہ خوگر بنا دیتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ

شراب پئیں گے لیکن اس کو شراب کا نام نہیں دیں گے، **یسمونها بغیر اسمها** (نسائی: ۵۶۵۸) نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی کم عمر لڑکے کو شراب پلائی، جس کو حلال وحرام کا شعور نہیں، تو اللہ پر ضروری ہے کہ قیامت کے دن اسے لکھنا ہے۔

(جمع الفوائد: ۲/۳۷۹)

مغربی ملکوں میں شراب کی کثرت کی ایک اہم وجہ خاندانی نظام کا بکھراؤ بھی ہے، خاندانی روابط کے کمزور پڑ جانے اور رشتوں کے بکھر جانے کے باعث لوگ اپنی نجی زندگی میں ذہنی اور قلبی سکون سے محروم ہیں، اس لئے چند ساعت کے سکون کے لئے نشہ کرتے ہیں کہ کچھ تو قلب کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی معاشرہ میں زیادہ تر یہ چیز بغیر سمجھے بوجھے مغرب کی نقل اور فیشن کی دین ہے، اب جرائم پیشہ اور مافیا گروہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشہ کا عادی بنا کر ان کا استحصال کرتا ہے، ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے آلۂ کار بناتا ہے اور ان سے نشہ کی تھوڑی مقدار کے عوض قتل وراہزنی، چوری اور عصمت فروشی کے کام لیتا ہے، تعلیم گاہوں میں منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان ستم بالائے ستم، اور نقصان بالائے نقصان کا مصداق ہے۔

اس برائی سے سماج کو بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ ایک طرف لوگوں کو نشہ کے نقصانات کے بارے میں باشعور کیا جائے اور اس کے نقصانات سے ہر سطح پر آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ان اسباب پر روک لگائی جائے جو منشیات کے پھیلنے میں ممد و معاون ہیں، اگر شراب بیچنے کے پرمٹ بھی جاری کئے جائیں اور دوسری طرف شراب سے منع بھی کیا جائے تو یہ تو ایک مذاق ہوگا جہاں قدم قدم پر شراب کی دکانیں کھلی ہوں، ہوٹلوں میں شراب بِکے، خریدی جاتی ہو، سرکاری تقریبات میں جام و سبو پیش کئے جاتے ہوں، وہاں شراب کی برائی کیوں کر لوگوں کے ذہن میں راسخ ہو سکے گی، اور کیسے سماج کو اس لعنت سے نجات حاصل ہوگی؟ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے، نچوڑنے والے پر، نچوڑوانے والے پر، پینے والے پر، اٹھا کر لے جانے والے پر، اس پر جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے،

ساقی پر، بیچنے والے پر، اس کی قیمت کھانے والے پر، خریدنے والے پر اور اس شخص پر جس کے لئے خرید کی جائے (ترمذی، حدیث: ۱۲۹۵)___ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ملک کے حکمراں اور اربابِ اقتدار سرتاپا اس کی مضرتوں سے واقف ہیں، پھر بھی اس لئے اس پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں کہ اس تجارت سے حکومت کو اپنی شاہ خرچیوں اور اربابِ اقتدار کو اپنی عشرت کوشیوں کے لئے ڈھیر سارا ٹیکس وصول ہوسکتا ہے؟؟

(۲۳رجولائی ۱۹۹۹ء)

کردار کشی

الیکشن کا طوفان تھم چکا ہے، اور ہندوستان کے اکثر علاقوں میں الیکشن کا عمل پورا ہو چکا ہے، الیکشن کے نتائج بیلٹ بکس میں بند ہیں، اور ہزاروں امیدواروں کی قسمتیں ان بند ڈبوں سے متعلق ہیں، یہ الیکشن صرف سیاسی زور آزمائی اور عوامی مقبولیت ہی کی آزمائش نہیں، بلکہ ہمارے اخلاق و کردار، زبان و بیان اور شرافت کا بھی امتحان ہیں، ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے، جو شروع سے مذہبی وابستگی میں ممتاز رہی ہے، بودھ مذہب ہو یا جین مت، ایران سے آیا ہوا پارسی مذہب ہو، یا خود ہندوستان میں پیدا ہونے والا سکھ دھرم، ہندو مذہب ہو یا حق و سچائی کا آخری اور مکمل ترجمان مذہب اسلام، ان سب کے نقوش اس ملک کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں، اور یہاں کی تہذیب و ثقافت ان کے گہرے اثرات سے خالی نہیں ہے، مذہب خواہ کوئی بھی ہو، اور عقیدہ و عمل میں خواہ کسی قدر بھی اختلاف ہو، شرافت، اخلاق اور انسانیت کا پیغامبر ہوتا ہے، اس لئے رواداری، مروت اور بردباری ہندوستان کی اصل فطرت ہے، اگر اس ملک کی فطرت میں یہ عنصر نہ ہوتا تو مختلف قوموں کو یہاں پناہ نہ ملی ہوتی، اور یہ تہذیبوں اور قوموں کا گلدستہ نہ بنا ہوتا۔

لیکن کیا ہم نے اپنی اس قومی روایت کو باقی رکھا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں چاہئے کہ آپ اپنا امتحان لیں، اور خود اپنا احتساب کریں، جب حالات معتدل ہوں، اس وقت انسان کے اخلاق اور سلوک کی آزمائش نہیں ہوتی، انسان غیر معمولی حالات میں ہی پہچانا جاتا ہے، الیکشن بھی آزمائش کی کسوٹی ہے، یہ موقع، مفادات کے ٹکراؤ، نظریات کے تصادم اور ہندوستان کی سیاست میں مختلف خاندانوں کے ہوس اقتدار کا ہوتا ہے، اس موقعہ سے ہمارے اخلاق کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، اور اندرونی جذبات اجل

پڑتے ہیں، اخلاق وانسانیت کے مصنوعی نقاب جو ہم نے پہن رکھے ہیں، تار تار ہو جاتے ہیں، اور اس کے اندر جو مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے وہ سامنے آجاتا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے سیاسی قائدین نے کیا کچھ نہیں کہا، اور نہیں کہلایا؟ بی، جے، پی لیڈروں نے محترمہ سونیا گاندھی کے خلاف کیسے اوچھے ریمارک کئے، اور پھر کانگریس کے جنرل سکریٹری نے اٹل بہاری واجپئی وزیر اعظم پر کیسے ناشائستہ جوابی حملے کئے؟ ملک کی بعض دوسری خواتین امیدواروں پر بھی اخبار کی دنیا میں ایسی پھبتیاں کسی گئیں کہ شریف آدمی تنہائی میں بھی ان کو کہنے سے شرمائے، خود ہمارے مسلمان قائدین نے ایک دوسرے کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا؟ تقریروں میں ایک دوسرے کے نجی حالات بلکہ اس کی کئی پشتوں کے حالات بیان نہیں کئے گئے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک دوسرے کی عزت وآبرو کو بھی نشانہ بنایا گیا؟ یہ ہماری اخلاقی پستی اور فکری رفاءت کا مظہر ہے، اپنے نظریات کو پیش کرنا اور مخالف نظریہ پر تنقید کرنا بری بات نہیں، بلکہ جمہوریت کا ضروری حصہ ہے، معیاری تنقید سے بڑھ کر جمہوریت کے لئے کوئی قیمتی تحفہ نہیں ہوسکتا، لیکن ضروری ہے کہ تنقید ہو نہ کہ تنقیص، اور تنقید ادب وشائستگی کے دائرہ میں ہو۔

جب نفس پر چوٹ پڑے اور اپنے کردار کو ٹھوکر لگے، وہی وقت انسان کے اخلاقی معیار کو پرکھنے کا ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو زیر کردے بلکہ حقیقی بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، **انما الشدید الذی یملك نفسه عند الغضب** (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۱۴، مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۰۹)

ایک بار ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کرنے کی خواہش کی، آپ نے ارشاد فرمایا: **لا تغضب** یعنی غصہ نہ کرو، وہ بار بار آپ ﷺ نصیحت کی خواہش کرتے رہے اور آپ ہر بار یہی ارشاد فرماتے کہ غصہ نہ کرو، (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۱۶، ترمذی حدیث نمبر: ۲۰۲۰)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے عصر کے بعد صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اس خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ مزاج کے اعتبار سے انسان مختلف نوع کے ہوتے ہیں، ان میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو غصہ دیر سے آئے اور جلد

چلا جائے، خیرهم مبطی الغضب و سریع الفئی اور سب سے خراب شخص وہ ہے جس کو غصہ آئے جلدی اور جائے دیر سے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۹۱) اس لئے انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی مسائل میں اس سے بھی بڑھ کر غیظ و غضب کو قابو میں رکھنا چاہئے، کہ حد اعتدال سے بڑھتا ہوا غصہ، نفرت اور حسد کا جذبہ ہی انسان کو بے قابو کرتا ہے اور غیر معتدل بنادیتا ہے۔

نرم خوئی اور نرم کلامی سے وہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، جو تند مزاجی یاوہ گوئی اور کردار کشی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم خو ہیں، نرم خوئی کو پسند فرماتے ہیں اور نرم خوئی پر وہ کچھ عنایت کرتے ہیں جو تند خوئی پر نہیں دیتے، ان الله رفیق یحب الرفق ، و یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۹۳) آپ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے آراستہ اور خوبصورت بنادے گی، ان الرفق لا یکون فی شئی الا زانه اور جو چیز نرمی سے محروم ہوگی، وہ بدنمائی سے خالی نہ ہوگی، و لا ینزع من شئی الا شانه (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۹۴) اس لئے تنقید اگر صالح اور تعمیری ہو، شریفانہ ہو اور حدود ادب میں ہو، تو ایک بہتر چیز ہے، لیکن اگر تنقید کا منشا کردار کشی اور ذاتیات پر حملہ کرنا ہو، تو یہ نہایت قبیح، غیر اسلامی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔

آپ ﷺ کے مخالفین اور کفار و مشرکین آپ کو ''محمد'' کی بجائے ''مذمم'' کہا کرتے تھے، ''محمد'' (ﷺ) کے معنی قابلِ تعریف کے ہیں، ''مذمم'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کی برائی بیان کی جاتی ہو، یہ کتنی بے ہودہ اور ناشائستہ حرکت تھی، وہ ظاہر ہے، لیکن آپ ﷺ مجسم رحمت تھے، اس لئے کبھی اس پر مشتعل نہیں ہوئے، اور نہ اپنے مخالفین کو کبھی قبیح ناموں سے یاد کیا، بلکہ صحابہؓ کو کفار کی اس حرکت پر غصہ آتا تو تسلی دیتے، اور فرماتے: اللہ نے ان کی لعنت و ملامت کو میری طرف سے پھیر دیا ہے، کہ وہ ''مذمم'' کو بُرا بھلا کہتے ہیں، اور میں ''محمد'' ہوں، (بخاری، حدیث نمبر: ۳۵۳۳) حدیث میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے اپنے بدترین مخالفین کے لئے بھی ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہوں، یا ان کی

ذاتی زندگی کے مفاسد کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہو۔

آپ ﷺ غیر مہذب کا جواب بھی مہذب طریقہ پر دیا کرتے تھے، یہود ہمیشہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے رہتے تھے، اور ایسے الفاظ کی تلاش میں رہتے تھے جس کے خراب معنی ہوں، اور وہ لفظی اور صوتی اعتبار سے کسی اچھے لفظ کے قریب ہو، تا کہ دھوکہ دیا جا سکے، چنانچہ سلام سے قریبی لفظ عربی میں ''سام'' ہے، جس کے معنی موت کے ہیں، جب آپ کو سلام کرتے تو ''السلام علیکم'' کی بجائے ''السام علیکم'' کہہ دیتے، جس کے معنی ہیں: ''آپ ﷺ پر موت آئے'' آپ ﷺ اس کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنے پر اکتفا کرتے، ایک بار کچھ یہود ملاقات کو آئے اور انہوں نے اسی طرح کے الفاظ کہے، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، ان سے رہا نہیں گیا، اور جواب دیا، ''بل علیکم السام واللعنة'' یعنی تم پر موت آئے اور لعنت ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! تم بدزبان نہ بنو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر معاملہ میں نرمی پسند ہے۔ ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ۔ (بخاری، باب النہی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام الخ)

قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کی دعوتی زندگی کا بہت تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف دعوت اسلام دینے کے لئے مامور فرماتے ہیں، فرعون کی سنگ دلی، اس کا ظلم و جور، کفر پر اس کا اصرار، بلکہ اپنی خدائی کا دعویٰ محتاج اظہار نہیں، لیکن اس کے باوجود حکم ہوا کہ ان کو نرمی کے ساتھ دعوت دینا شاید اسے عبرت ہو اور اس میں خدا کا خوف پیدا ہو، ''فَقُوْلَا لَـهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَـخْشٰى'' مقامِ فکر ہے! کہ فرعون جیسے ظالم و جابر اور متکبر کافر کے ساتھ بھی نرم گفتاری کی تلقین کی جارہی ہے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی چال ڈھال بھی تواضع اور فروتنی کا مظہر ہوتی ہے، اور جب اوچھے قسم کے لوگ ان سے ناشائستہ باتیں کہتے ہیں تو وہ ان سے بھی کلمہ خیر کہہ کر ہٹ جاتے ہیں: ''و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما''۔ (الفرقان: ۶۳)

رسول اللہ ﷺ کے یہاں عزتِ نفس کا اس درجہ خیال تھا کہ غیر مسلموں میں بھی جو اصحاب وجاہت ہوتے، آپ ﷺ ان کا لحاظ فرماتے، آپ ﷺ نے بادشاہ روم ہرقل کو خط لکھا تو ''عظیم الروم'' کے لفظ سے خطاب فرمایا، یعنی روم کا عظیم شخص، بعض صحابہ کو اس تعبیر پر تامل تھا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو اسی طرح کہتے ہیں، بعض سرداران قبائل کو از راہِ احترام آپ ﷺ نے اپنا تکیہ پیش فرمایا، ابوسفیان اہلِ مکہ کے سردار تھے، فتحِ مکہ کے موقع سے آپ ﷺ نے ان کا اعزاز کرتے ہوئے فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اسے امن ہے، ''من دخل دار ابی سفیان فهو آمن'' یہ آپ ﷺ کا سلوک و برتاؤ غیر مسلموں اور اعداءِ اسلام کے ساتھ تھا، اور ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس پر انسانیت شرمائے، اور جس سے شرم وحیا کو عار آئے۔

یہ کردارکشی جو اسٹیج پر ہوتی ہے اور پوسٹر اور اخباری اشتہار کو بھی اس کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنایا جاتا ہے اور سوال و جواب، پھر جواب الجواب اور اس کے بعد اس جواب کا جواب جو کیا جاتا ہے اور لوگوں کی عزت وآبرو سے کھیلنے میں جس چوکسی اور مہارت کا ثبوت دیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے سراسر باعثِ شرم و عار ہے، باہمی کردارکشی اور آبروریزی کے بغیر بھی ہم اپنا مدعیٰ لوگوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں، اور ہم اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ہماری یہ اخلاقی پستی اور دناءت عام مسلمانوں کو غلط اشارے دیتی ہے، جب مسلمانوں کے قائدین اور محترم شخصیتیں ہی اس سطح پر اتر آئیں تو عوام سے کیوں کر توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے دور رکھ سکیں گے؟ جس سفینہ کا ناخدا ہی آدابِ سفر سے بے بہرہ ہو، کون ہے جو اسے ساحل سے ہمکنار کرے؟ ___ کاش! ہمارے سیاسی قائدین اور ان قائدین کے معاونین وانصار جو بہر حال ظہر اس ''خیرات'' ہی کا ایک حصہ ہیں، اس حقیقت پر غور کریں!

(۱۷/ ستمبر ۱۹۹۹ء)

پانی جس نے آگ لگادی

پانی کا کام آگ بجھانا اور ٹھنڈک بخشنا ہے، لیکن اس وقت ''پانی'' نے پورے ملک میں آگ لگا رکھی ہے، قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون سا آتش خیز اور حرارت ریز پانی ہے؟ میری مراد ''Water'' نامی فلم سے ہے! جسے دیپا مہتا نامی ہدایت کار بنا رہی ہیں، اس سے پہلے ان ہی خاتون نے ''آگ'' لگائی تھی، اور ''آگ'' نامی فلم تیار کی تھی، شیوسینا کے کارکن اس فلم پر اتنے برہم ہوئے کہ حقیقی معنوں میں کرتے پاجامے سے باہر آگئے، اور اب وہ ایسا پانی پیش کر رہی ہیں جو آگ سے بھی بڑھ کر گرم ہے، ''فائر'' نامی فلم ہم جنسی کے موضوع پر تھی، ظاہر ہے کہ یہ بے حیائی اور بے شرمی پر مبنی فلم ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جو بڑی حد تک ایسی اخلاقی بیماریوں سے پاک اور محفوظ ہے، وہاں ہم جنسی کے موضوع پر کسی فلم کا آنا ایک بے معنی بات ہے، اور اس کا نتیجہ برائی کی تشہیر و ترغیب کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

دیپا مہتا کی نئی فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہبی طبقہ میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی اور ہندو معاشرہ میں خواتین بالخصوص بیوہ خواتین کے ساتھ ناروا سلوک اور ان کی حالتِ زار کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: اول یہ کہ جو باتیں اس کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں کیا وہ حقائق پر مبنی ہیں؟ دوسرے اگر حقائق پر مبنی ہیں تو کیا ہر حقیقت کا اظہار مناسب ہوتا ہے، اس سے قطعِ نظر کہ اس سچائی کا اظہار سماج کے لئے مفید ہے یا مضر، اور فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مذہبی مصادر میں اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض باتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، رام جی ہندوؤں کے یہاں نہایت ہی مقدس شخصیت سمجھی

جاتی ہے، اور اس وقت تو ''رام'' کا نام ہندو فکر و تہذیب کا عنوان بن چکا ہے، لیکن رامائن رام کی زبان میں سیتا کے حسن کی جو تصویر کھینچتا ہے وہ کھلی ہوئی بے حیائی پر مبنی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی لکشمن کے سامنے سیتا کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، لنگ اور یونی مردانہ اور زنانہ اعضاء مخصوصہ کو کہا جاتا ہے، ہندو مذہب میں لنگ اور یونی کی بھی پرستش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان فحش الفاظ سے بچوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں، جیسے شیولنگم، رام لنگم وغیرہ، کرناٹک میں بعض مندر ایسے ہیں جہاں مرد و عورت کو بے لباس ہو کر پوجا کرنی پڑتی ہے، حکومت اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن اکثر حکومت کی ممانعت پر مذہبی جذبات غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اسی لئے ہندو مذہبی حلقہ میں مرد و عورت کے جنسی تعلق کے طریقے اور کیفیات تحقیق و تالیف کا خاص موضوع ہے، اور اس موضوع پر ''کام سوتر'' کے نام سے کئی مذہبی کتابیں اوباش قسم کے لوگوں کے لئے لذتِ کام و دہن کا سامان ہیں، بے حیائی اور بد اخلاقی کو مذہبی رنگ دینے کے لئے برہمنوں نے ''دیوداسی نظام'' شروع کیا، اس رسم کے تحت عام ہندو اور خاص کر نچلی ذات کے لوگ اپنی لڑکیوں کو مندروں پر مذہبی جذبہ سے وقف کیا کرتے تھے، اور لوگوں کو دھوکہ دے کر مذہبی شخصیتیں ان سے اپنی شبستانِ ہوس سجایا کرتے تھے، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس نامعقول رسم کو ختم کرنے کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں، لیکن بدقسمتی سے اب تک مہاراشٹر، کرناٹک اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں یہ رسم باقی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''دیوداسی نظام'' کو اگر مذہبی قحبہ گری کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا!

چنانچہ اس مذہبی فکر نے ہندو تمدن پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، ''کھجوراہو'' کا مندر اور ''اجنتا'' کے غار اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہیں، جیسا کہ کہنے والے کہتے اور نقل کرنے والے نقل کرتے ہیں کہ کوئی شریف اور حیادار انسان اپنے بزرگوں یا عزیزوں کے ساتھ ان مناظر کو دیکھ نہیں سکتا، ہندو تحریکات پر بھی وقفہ وقفہ سے بے حیائی کی چھاپ نمایاں رہی ہے، اس کی واضح مثال اچاریہ رجنیش اور ''ہرے راما ہرے کرشنا تحریک'' ہے، اس

لئے یہ ایک تلخ حقیت اور کڑوی سچائی ہے کہ ہندو مذہب کی جو تصویر اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ اخلاقی نقطہ نظر سے کسی مذہب کے شایان شان نہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ یہ مذہب کی حقیقی تعلیمات میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہے، ورنہ کسی مذہب کے بارے میں ایسی حیاباختہ فکر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوسماج میں عورتوں کی مظلومیت بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، منوسمرتی عورتوں کے بارے میں صاف کہتی ہے کہ کسی عورت پر کبھی بھروسہ مت کرو، کسی بھی عورت کے ساتھ تنہا مت بیٹھو خواہ وہ تمہاری ماں ہو، یا بیٹی یا بہن، وہ آپ کو غلط ترغیب دے سکتی ہے، اسے شوہر سے علاحدگی کا حق نہیں، نہ ہندومذہب میں اس کے لئے میراث ہے، نہ وہ اپنے لئے رشتہ منتخب کرسکتی ہے، بیوہ عورتیں منحوس سمجھی جاتی ہیں، وہ دوسری شادی نہیں کرسکتیں، ان کو زندگی بھر بناؤ سنگار سے دور رہنا ہے، اور سب سے بڑا ظلم ستی کی رسم ہے، ہندو عقیدہ کے مطابق ایک عورت کے ستی ہونے کی وجہ سے تین خاندان کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اس کے والد کا خاندان، اس کی والدہ کا خاندان، اور اس کے شوہر کا خاندان، اس ترقی یافتہ دور میں بھی ستی کی وکالت کرنے والے لوگ موجود ہیں، پوری کے شنکر اچاریہ نے علی الاعلان کہا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے ستی ہونے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں، اور حکومت کے ذریعہ اس رسم پر پابندی لگائے جانے کی وہ پوری قوت سے مخالفت کریں گے، خواہ انہیں پھانسی پر کیوں نہ چڑھا دیا جائے، جب ان سے پوچھا گیا کہ ایسی خواتین کے بچوں کا کیا ہوگا؟ تو بے تکلف جواب دیا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے، بچے خواہ تکلیف اٹھائیں یا مرجائیں، ستی بہر حال ہندو مذہب میں جاری رکھی جائے گی، جب ہندو مذہب کے سب سے بڑے پیشوا ستی کے وکیل ونقیب ہوں تو اگر روپ کنور یا ان جیسی دوسری بھولی بھالی خواتین کے ستی ہونے کا واقعہ پیش آئے تو تعجب نہ ہونا چاہئے!

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی بے راہ روی اور عورتوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہندوسماج میں موجود ہے، اور سب سے بدبختانہ بات یہ ہے کہ اس کو

مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے، یہ کہنا تو بہر حال صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستان کے تمام مذہبی شخصیتوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جائے کہ وہ سب ایسی باتوں میں برابر کے شریک ہیں، یقیناً ان میں شریف، سمجھ دار، تقاضۂ حیا سے آگاہ اور انسانی نجابت کی ترجمان شخصیتیں بھی ہوں گی، اور ان سب کے بارے میں ایک ہی طرح کا خیال قائم کر لینا شاید قرین انصاف نہ ہو، ____ لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں پر سچائی کا اعلان واظہار کیا جانا چاہئے؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ہے۔

ایسی سچائی جو سماج کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچائے، جو خیر کی اشاعت کی بجائے بدی کی تشہیر کا باعث ہو، جو لوگوں کو شرافت وصالحیت کی بجائے بدخوئی کی طرف لے جاتی ہو، اس سچائی کو ظاہر کرنے سے چھپانا بہتر ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ یہاں جھوٹ بہ مقابلہ سچ کے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اگر ایک مظلوم اور کمزور شخص نے آپ کے یہاں پناہ لے رکھی ہے، ایک بے بس عورت اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کے لئے چھپی ہوئی ہے، اور ایک ظالم اس مظلوم کے قتل اور ایک اوباش اس عورت کی عصمت ریزی کے درپے ہو اور آپ کے جھوٹ سے اس شخص کی جان اور اس عورت کی عزت بچ سکتی ہو، اور آپ کے سچ سے جان جاسکتی ہو اور ایک عورت کی چادر عفت تار تار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ضرورت ہے کہ ان حالات میں آپ کے لئے جھوٹ بولنا ہی واجب ہے، اور سچ بولنا اس جرم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔

فلم خواہ کوئی بھی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے وہ گناہ ہی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلم بنیادی طور پر بُرائی کی ترویج اور سفلی جذبات کی تحریک ہی کا ذریعہ ہے، اس سے کسی خیر کی توقع نہیں، لیکن ایسی فلمیں جن کا مقصد شروع سے اخیر تک نفسانی جذبات کی تسکین ہی ہو، جس کا منشا بُرائی کی خاص طور پر تشہیر ہو اور جو مذہبی جذبات کے احترام اور تقدیس کی حدوں کو بھی مجروح کرتی ہو یقیناً شر بالائے شر اور گناہ برتر از گناہ ہے، ممکن ہے کہ سنگھ پریوار کے لوگ اس لئے اس فلم کی مخالفت کر رہے ہوں کہ اس سے برہمنی افکار وتصورات پر زد

پڑتی ہے، اور ہندو تمدن کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، لیکن اس سے قطعِ نظر تمام ہی سنجیدہ لوگوں کے لئے یہ اور اس طرح کی فلمیں قابلِ مذمت ہیں کہ ایک تو اس سے بُرائی کی تشہیر ہوتی ہے، دوسرے اس سے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے کی نہایت ہی ناشائستہ اور غلط روایت قائم ہورہی ہے، جو بڑے فساد اور انتشار کا موجب بن سکتا ہے، قرآن مجید نے تو اس پہلو کو اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ شرک سے بڑھ کر اسلام میں کوئی شئی قابلِ مذمت نہیں لیکن مشرکین جن دیویوں، دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہوں، ان کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کیا گیا، کہ ہر انسان کے لئے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء)

افواہیں اور ہمارا رویہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی صلاحیتوں کو محدود رکھا ہے، اس کی قوتیں ایک خاص دائرہ میں کام کرتی ہیں، مثلاً انسان کو ایک بہت بڑی نعمت دیکھنے کی دی گئی ہے، پتھر اور لوہے کس قدر مضبوط ہیں، سمندر کا دامن کس قدر وسیع اور بے پناہ ہے، لیکن وہ دیکھ نہیں سکتے، انہوں نے آج تک خود اپنے حسن و جمال کو بھی دیکھا نہیں ہوگا، لیکن ایک خاص حد تک چیزوں ہی کو انسان دیکھ سکتا ہے، اگر کوئی رکاوٹ نہ بھی ہو تو انسان کو آدھے ایک کیلومیٹر سے آگے کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، اگر بیچ میں دیوار حائل ہو تو بالکل قریب کی چیزوں کو بھی وہ نہیں دیکھ سکتا، انسان میں سننے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، لیکن اس کا بھی یہی حال ہے، اس کی سماعت کا دائرہ چند فرلانگ تک ہوتا ہے، یہ بھی اس وقت ہے کہ جب کہ کوئی چیز حائل نہ ہو، ورنہ دو کمروں کے بیچ چند انچ کی دیوار ہوتی ہے اور ایک طرف کی آواز دوسری طرف بالکل سنائی نہیں پڑتی، انسان کے دیکھنے اور سننے کے دائرہ کو جو محدود رکھا گیا ہے بظاہر یہ ایک محرومی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہر انسان اپنے لئے ایسی تنہائی (Privacy) چاہتا ہے جو دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہو، انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہیں، جن میں دوسروں کی آنکھ اور کان کے تعاقب سے باہر ہونا، اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، فرض کیجئے کہ کسی مکان میں بہت سے کمرے ہوں، ہر کمرے میں الگ الگ لوگ رہتے ہوں، وہ سب ہمہ وقت ایک دوسرے کی نظر میں ہوں اور ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی بات کانوں سے ٹکراتی رہتی ہو، تو اس کے لئے زندگی گزارنا کتنا دوبھر ہو جائے گا، اسے اپنے مکان میں رہتے ہوئے بھی ایسا محسوس ہوگا کہ وہ ریلوے کے کسی مصروف پلیٹ فارم

پر مقیم ہے، اس لئے انسان کی صلاحیتوں کا محدود ہونا بظاہر ایک محرومی معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان کے لئے سامان راحت بلکہ ایک ضرورت ہے۔

انسان اپنی محدود دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کی وجہ سے بہت سی باتیں جاننے میں دوسروں کی اطلاع کا محتاج ہوتا ہے، اس کے سوا چارہ نہیں، کہ اپنے چشم سر سے دیکھے اور گوش سر سے سنے بغیر بعض امور کو تسلیم کرے، اس لئے دنیا کا سارا کاروبار دوسروں کی دی ہوئی خبر پر اعتماد ویقین سے متعلق ہے، اور اسی طرح نظام زندگی جاری وساری ہے، خبریں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی، سچی بھی ہوتی ہیں اور جھوٹی بھی، خبر دینے والے جھوٹے بھی ہوتے ہیں، بعض لوگ طبعاً برے نہیں ہوتے لیکن ان کی طبیعت میں مبالغہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کے ایسے بازیگر ہوتے ہیں، کہ سننے والوں کو رائی پہاڑ محسوس ہوتا ہے، کچھ لوگ شریف اور نیک خو ہوتے ہیں، لیکن سادہ لوح اور بھولے بھالے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں، کسی خبر پر جرح نہیں کرتے، اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر مان لیتے ہیں، بعض حضرات سے کسی بات کو سننے یا سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے، یہ مختلف اسباب ہیں، جن کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ اور بالارادہ یا بلا ارادہ خلاف واقعہ باتیں لوگوں میں چل پڑتی ہیں، ایسے ہی بے سروپا باتوں کو ''ہوا'' کہتے ہیں۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے کچھ لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، یہ دوڑ بھاگ کسی اور سبب سے تھی، لیکن شہر کی فضاء کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا کہ شاید دو گروہوں کے درمیان تصادم ہو گیا ہے، اب اس خوف سے انہوں نے خود بھاگنا شروع کیا، آتے ہوئے راستہ میں جو لوگ ملے ہمدردی وبہی خواہی میں انہیں بھی واپس ہونے کی صلاح دیدی، پھر خبر ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں پہونچی، اور ایک فرقہ کے ناسمجھ لوگوں نے دوسرے فرقہ کے لوگوں پر وار کر دیا یہاں تک کہ پورا شہر فساد کی آگ میں بھڑکنے لگا، اور اس بے تحقیق خبر کی چنگاری نے پورے علاقہ کے امن وامان کو نذر آتش

کر دیا، اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں پیش آتے رہتے ہیں، افواہوں کی بنا پر گروہی لڑائیاں ٹھن جاتی ہیں، ادارے اور جماعتیں تقسیم ہو جاتے ہیں، اجتماعی کاموں میں رخنہ پڑتا ہے، خاندانوں میں نفرت کی آگ سلگ جاتی ہے، بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، یہاں تک کہ میاں بیوی میں طلاق کے واقعات پیش آجاتے ہیں، والدین، اولاد اور قریب ترین اقارب کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے، افواہوں کے گرم بازاری نے بہت سے مخلص، محبِ قوم، برگزیدہ شخصیتوں کو بے آبرو کیا ہے، اور خود غرضی و بدخواہ افراد کی طالع آزمائی کو کامیابی سے ہم کنار کر کے قوم و ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے۔

افواہوں کو جنم دینا انہیں پھیلانا اور ان کو تقویت پہونچانا نہایت ہی ناشائستہ و نامناسب عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اخبار و واقعات کے بارے میں یہ اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ جب کوئی ناقابلِ بھروسہ آدمی کوئی خبر لائے تو جب تک اس کی اچھی طرح تحقیق نہ ہو جائے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ."

(الحجرات:٦)

اے ایمان والو! اگر کوئی ناقابل بھروسہ (فاسق) شخص کوئی اہم خبر دے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہ کہیں کسی قوم پر تم ناواقفیت میں حملہ نہ کر دو کہ پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بے تحقیقی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہئے، اور اگر اس پر یقین کیا گیا تو یہ نقصان اور مضرت کا باعث ہوگا، یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو مصطلق کی طرف ____ جو مسلمان ہو چکے تھے ___ اپنے نمائندہ ولید بن عقبہ کو بھیجا، بنو مصطلق نے جب نمائندہ نبوی کو دیکھا تو ان کے احترام و توقیر کے لئے آبادی سے باہر نکل آئے، ولید نے سمجھا کہ یہ لوگ ان کے

قتل کے درپے ہیں اور پچھلے پاؤں واپس آگئے، آکر حضور کو اطلاع دی کہ یہ لوگ مرتد ہوگئے ہیں، یہ زکوٰۃ ادا کرنے کے منکر ہیں، اور وہ ان کے قتل کے درپے ہوگئے تھے، آپ ﷺ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمالیا، ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھے کہ بنو مصطلق کا وفد آپہونچا، انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے قاصد آرہے تھے، ہم اس لئے نکلے کہ ان کا استقبال کریں اور اپنی زکوٰۃ ان کی خدمت میں پیش کریں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم لوگ ان سے جنگ کے لئے نکلے تھے، سو یہ غلط ہے، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، (قرطبی: ۱۶/۳۱۱) ___ غور کیجئے کہ یہ عہد نبوی کا واقعہ ہے، اور یہ اطلاع ایک صحابی رسول کی تھی، انہوں نے دانستہ غلط بیانی سے یقیناً کام نہیں لیا تھا کہ یہ مقام صحابیت سے فروتر بات ہے، بلکہ یہ محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، یہ نادانستہ غلط فہمی بھی کتنے بڑے انتشار کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، تو جہاں افواہیں بالقصد پیدا کی جاتی ہوں، ان سے کس قدر نقصان ہوگا؟

افواہوں کے پھیلنے کے چند خاص اسباب ہیں، ان میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ لوگ ہر سنی سنائی ہوئی بات کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں، خواہ وہ بات کس قدر بھی بے بنیاد ہو، بعض لوگوں نے اس کے لئے دروغ برگردن راوی کی ایک خود ساختہ بیساکھی تیار کر رکھی ہے، اور اس کے ساتھ ہر گفتنی و ناگفتنی کو نقل کر دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے، یہ بھی خدا سے بے خوفی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے فرمایا: آدمی کے گناہ گار ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کر دے: **كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع** (مسلم، حدیث نمبر (۷) مقدمة الکتاب) ___ ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنے سے معاشرہ میں کس طرح بگاڑ پیدا ہوتا اور فساد پھیلتا ہے، اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آنے والا واقعہ افک ہے، کچھ بیمار ذہن منافقین نے امت کی ماں سیدنا حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگادی، اور اس افواہ کو پھیلانے کی خوب کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سادہ لوح، مخلص مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے اور مدینہ میں ایسے انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی کہ

حیاتِ نبوی میں شاید ہی کسی اور واقعہ سے آپ کو اس درجہ تکلیف پہونچی ہو، یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ ایک سنی سنائی بات کو کچھ لوگ بلا تحقیق کہتے چلے گئے۔

ان افواہوں میں اضافہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو بری باتوں کے متلاشی رہتے ہیں، لوگوں کی برائیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں تجسس سے جن کو لذت ملتی ہے، اور کسی واقعہ میں اگر چند احتمالات ہوں، تو منفی پہلو کی طرف ان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، اس طرزِ عمل کو حضور نے پسند نہیں کیا، اسی لئے تجسس کو منع کیا گیا، اور ان لوگوں کو کج فکر قرار دیا گیا جو کسی بات کی غلط تاویل و توجیہہ کے درپے ہوتے ہیں،

" فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيْلِهِ " (آل عمران: ۷)

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ برپا کرنے اور (من چاہی) تاویلیں کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

افواہیں عام طور پر اعلانیہ نہیں پھیلائی جاتیں، ریڈیو اور اخبارات کو ان کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا، (ویسے آج کل حکومتوں کے غیر ذمہ دارانہ اور ذرائع ابلاغ کے جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے ایسا بھی ہو رہا ہے)، بلکہ زیادہ تر سینہ بسینہ افواہیں پھیلائی جاتی ہیں، اور سرگوشیوں کے ذریعہ گشت کرتی رہتی ہیں، اسی لئے زیادہ تر سرگوشیوں کو قرآن مجید نے پسند نہیں کیا: "لا خير من كثير في نجواهم" (النساء: ۱۱۴)

کسی بھی خبر کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا تو انسان خود اس کی تحقیق کر لے، یا کم سے کم ایسے سمجھدار، معاملہ فہم، اور زمانہ آگاہ لوگوں کی طرف رجوع کرے، جن کے بارے میں توقع ہو کہ وہ مناسب طریقہ پر اس کی تحقیق کرنے کے بعد کوئی صحیح قدم اٹھائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جب ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہونچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، اگر وہ اس کو رسول اور اپنے میں سے ذمہ داروں تک پہونچا دیتے تو اسے وہ لوگ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہہ تک

پہونچ کر صحیح نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت
نہ ہوتی تو تم تو شیطان کی پیروی کرنے والے ہو جاتے۔(النساء:۴۳ - ۷۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی مرض کا علاج بتایا ہے جو افواہوں کا باعث ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جو باتیں اہم ہوں ان کے بارے میں اگر انسان خود تحقیق کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کی صلاحیت رکھنے والوں سے رجوع کرلے اور کسی بھی بات کو بلا تحقیق بیان کرنے، بلکہ خود بھی اس پر یقین کرنے سے گریز کرے، کیوں کہ انسان اپنے کانوں، اپنی آنکھوں اور اپنے دلوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہے، اس کے بارے میں وہ عنداللہ جوابدہ ہے، "ان السمع والبصر والفواد کل اولئك کان عنه مسئولا" (الاسراء:۳۶)

(۲۲/مارچ/۲۰۰۲ء)

وعدہ خلافی —— ہمارے سماج میں!

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لئے آخرت کا نظام یہ رکھا ہے کہ چیزوں کا مہیا ہونا انسان کی خواہشات کے تابع ہوگا، انسان جو چاہے گا فوراً اس کے لئے وہ چیز فراہم ہو جائے گی، "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ" (حم السجدہ: ۳۱) لیکن دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہاں انسان ایک چیز کی خواہش کرتا ہے، لیکن وہ اسے بروقت پورا نہیں کرسکتا، وہ ایک چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے، لیکن وہ چیز اسے بروقت مہیا نہیں ہوتی، اسی لئے انسان ایک دوسرے سے لین دین کا محتاج ہوتا ہے، اس لین دین میں اکثر عہد و پیمان کی نوبت آتی ہے، اس لئے شاید ہی کوئی انسان ہو جس کو زندگی کے مختلف مراحل میں خود وعدہ کرنے یا دوسروں کے وعدہ پر بھروسہ کرنے کی نوبت نہ آتی ہو، وعدہ کرنے والے پر دوسرا شخص بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے، اور بعض دفعہ اس اعتماد پر خود بہت سے معاملات طے کرگذرتا ہے، اس لئے وعدہ کی بڑی اہمیت ہے۔

اسی لئے اسلام میں بڑی تاکید کے ساتھ عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور عہد شکنی کی مذمت کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عہد کو پورا کرو، کیونکہ قیامت کے دن عہد کے بارے میں انسان جواب دہ ہوگا، "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ، إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" (بنی اسرائیل: ۳۴) قرآن نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو وعدہ کو پورا کیا کرتے ہوں، (البقرہ: ۲۴) ایک اور موقع پر بھی ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہوں، "وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ" (مومنون: ۸) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا بار بار ذکر فرمایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے، "وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ" (الحج: ۶)، اللہ کے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا

کہ وہ وعدہ کے سچے تھے، "اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ" (مریم: ۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ بھی ایفاءِ عہد کی اہمیت اور وعدہ خلافی کی بُرائی کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس میں تین باتیں پائی جاتی ہوں وہ منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اگر امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، (بخاری، حدیث نمبر: ۳۳) نفاق کفر کی ایک قسم ہے، اور وعدہ خلافی کو آپ ﷺ نے نفاق قرار دیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وعدہ خلافی کس قدر مذموم بات ہے، آپ ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ ایفاءِ عہد کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، عبداللہ بن ابی الحمساء سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ سے خرید و فروخت کی، آپ کی کچھ چیز باقی رہ گئی، میں نے وعدہ کیا کہ میں یہ چیزیں یہاں لے کر آتا ہوں، میں بھول گیا، یہاں تک کہ آج اور آئندہ کل کا دن گذر گیا، تیسرے دن میں حاضر ہوا تو آپ اسی جگہ پر تھے، آپ ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا: تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں یہاں تین دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۹۶)

وعدہ کی پابندی اور ایفاءِ عہد کا یہی سبق آپ ﷺ سے آپ کے رفقاء نے پڑھا، اور اپنی عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی وفات کا وقت آیا، تو فرمایا کہ قریش کے ایک شخص نے میری بیٹی کے لئے نکاح کا پیغام دیا تھا اور میں نے اس سے کچھ ایسی بات کہی تھی جو وعدہ سے ملتی جلتی ہے، تو میں ایک تہائی نفاق یعنی نفاق کی تین میں سے ایک علامت کے ساتھ اللہ سے ملنا نہیں چاہتا، اس لئے میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا (احیاء العلوم: ۱۳۲/۳) ____ ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی نگاہ میں وعدہ کو پورا کرنے کی کس قدر اہمیت تھی دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، اور مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ عہد کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ سے جوں ہی فارغ ہوئے حضرت ابوجندلؓ خون میں لہولہان اور پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوئی تشریف لے آئے،

اور مسلمانوں سے عرض کناں ہوئے کہ انہیں مدینہ لے جایا جائے، آپ ﷺ نے اہلِ مکہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، کہ اس دفعہ سے جو مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والوں کو واپس کرنے کے سلسلہ میں ہے، حضرت ابو جندل ؓ کو مستثنیٰ رکھا جائے، لیکن اہلِ مکہ نے نہیں مانا، چنانچہ بالآخر آپ نے انہیں واپس فرمادیا، اسی طرح جن غیر مسلم قبائل سے آپ کے معاہدات ہوئے، آپ نے ان معاہدات کا پورا خیال رکھا، بلکہ بعض دفعہ مخالفین کی عہد شکنی کو برداشت کرتے ہوئے بھی آپ اپنے عہد پر قائم رہے۔

افسوس کہ اخلاقی انحطاط اور پستی کی وجہ سے آج سماج میں وعدہ خلافی کی نوع بہ نوع صورتیں مروج ہوگئی ہیں، اور لوگوں کے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ قرض وغیرہ کے لین دین ہی سے وعدہ کا تعلق ہے، حالانکہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں عہد و پیماں سے گذرتے ہیں، معاملات جتنے بھی ہیں، نکاح، خرید و فروخت، شرکت اور پاٹنرشپ، دو طرفہ وعدہ ہی سے عبارت ہے، اسی لئے معاملات کو عقد کہا جاتا ہے، عقد کے معنی دو طرفہ وعدہ اور معاہدہ کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ایفاء عقود کی طرف متوجہ فرمایا ہے، ''وَاَوْفُوْا بِالْعُقُوْدَ'' (المائدہ:۱) نکاح کے ذریعہ مرد عورت کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کے اخراجات کی ادائیگی کا عہد کرتا ہے، اور عورت جائز باتوں میں شوہر کی فرماں برداری کا وعدہ کرتی ہے، لہٰذا اگر شوہر بیوی کے ساتھ حق تلفی کرے یا بیوی شوہر کے ساتھ حکم عدولی تو نہ صرف حق تلفی اور عدول حکمی کا گناہ ہوگا بلکہ وہ وعدہ خلافی کے بھی گناہ گار ہوں گے، بیچنے والا گاہک سے مال کے صحیح ہونے اور قیمت کے مناسب ہونے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ گاہک سے عیب چھپا کر سامان بیچے یا قیمت میں معمول سے زیادہ نفع وصول کرلے، اور گاہک کو جتائے کہ اس نے معمولی نفع پر سامان فروخت کیا ہے، تو یہ عقد تجارت کے ذریعہ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جو عہد کرتے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہے۔

جب آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں جو اوقات کار متعین ہوں، آپ ان اوقات میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے کا عہد کرتے ہیں، اگر آپ

ان اوقات کا پابندی نہ کریں، دیر سے دفتر پہونچیں، پہلے دفتر سے نکل جائیں، یا درمیان میں دفتر چھوڑ دیں، یا دفتر کے اوقات میں مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بجائے اپنے ذاتی کام کرنے لگیں، تو یہ بھی وعدہ کی خلاف ورزی میں شامل ہے، بعض شعبوں میں ملازمین کو خصوصی الاونس دیا جاتا ہے، کہ وہ پرائیوٹ طور پر کوئی اور کام نہ کریں، خاص کر میڈیکل شعبہ میں گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی پوری صلاحیت سرکاری دواخانے میں آنے والے مریضوں پر خرچ ہو، کیوں کہ انسان کی قوت کار محدود ہے، اور جو شخص ہسپتال میں آنے سے پہلے اپنی قوت ڈھیر سارے مریضوں کو دیکھنے پر صرف کر چکا ہو، یقیناً اب جو مریض اس کے سامنے آئیں گے، وہ کما حقہ، اس کی تشخیص نہیں کر سکے گا، اب اگر کوئی شخص گورنمنٹ سے الاؤنس بھی حاصل کرے، اور نجی کلینک اور نرسنگ ہوم بھی چلائے تو یہ وعدہ خلافی ہی کے زمرے میں آئے گا، اور یہ بات تو ستم بالائے ستم ہوگی کہ جب کوئی مریض سرکاری دواخانہ میں آئے، تو معالج اس سے ایسی بے اعتنائی برتے، کہ وہ اس کے پرائیوٹ دواخانہ سے رجوع ہونے پر مجبور ہو جائے، یہ وعدہ خلافی کے ساتھ ساتھ عوام پر کھلا ہوا ظلم بھی ہے۔

آج کل بعض سواریوں کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے میٹر لگے ہوئے ہیں، اس میٹر میں فریقین کی رعایت ملحوظ ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ پسنجر کی مجبوری اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے میٹر سے زیادہ پیسے طلب کئے جاتے ہیں، یہ بھی وعدہ خلافی کے زمرہ میں داخل ہے، کیوں کہ گورنمنٹ کا ٹیکس لائسنس ٹیکس کے قواعد وضوابط کے ساتھ مربوط ہے، گویا لائسنس لینے والا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی ہدایت کے مطابق ہی پیسے وصول کرے گا، لوگوں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے زائد پیسوں کا طلب گار ہونا اس عہد کی خلاف ورزی ہے۔

وعدہ کا تعلق ہماری تقریبات، جلسوں، اور دعوتوں سے بھی ہے، مثلاً دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ نکاح عصر کے بعد ہوگا، لیکن جب تقریب میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب اپنی شانِ خاص کے ساتھ عشاء کے بعد تشریف لائے، دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ

طعام ولیمہ ۸ ربجے شب میں ہے، لیکن حقیقت معنوں میں دعوت کی ابتداء دس بجے شب سے ہوئی کیا یہ عدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ غور کیجئے کہ لوگ ایسی تقریبات میں شرکت اپنے تعلقات کی پاسداری میں کرتے ہیں، کسی کے یہاں بیماری ہے، کوئی خود بیمار ہے، کسی نے تقریب کے وقت کے لحاظ سے آئندہ پروگرام بنا رکھا ہے، ایسے مواقع پر یہ تاخیر اس کے لئے کس قدر گراں گذرتی ہے آکر واپس ہونے میں میزبان کی ناگواری کا اندیشہ، اور انتظار کرنے میں دوسرے پروگرام متاثر!

افسوس کہ دینی جلسوں اور پروگراموں میں بھی ہم اس کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے، اعلان ہوا کہ نمازِ عشاء کے فوراً بعد جلسہ شروع ہوگا، لیکن عملاً مزید دو گھنٹہ تاخیر سے جلسہ کا آغاز ہوا، دعوت نامے میں صبح ۹ ربجے سے جلسہ کا اعلان کیا گیا، لیکن جلسہ کا آغاز ہی ۱۱ ربجے کے بعد ہوا، یہ وعدہ خلافی بھی ہے، اور وقت کی ناقدری بھی، کچھ یہی حال بعض مقررین کا ہوتا ہے، مقرر صاحب کو وقت ۲۰ رمنٹ کا دیا گیا، لیکن جب مائک ان کے ہاتھ میں آیا تو انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس پروگرام میں ان کے سوا کسی اور کو تقریر کا حق نہیں، اور اس طرح دوسرے مقررین کے لئے یا تو وقت نہیں بچا، یا سامعین کے صبر کا امتحان ہوتا رہا، حالانکہ اسلام نے تمام عبادتوں کو وقت کے ساتھ مربوط رکھا ہے، نماز کے لئے اوقات مقرر ہیں، وقت گذر جائے تو نماز قضاء ہو جائے گی، وقت سے پہلے پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی، روزہ بھی وقت سے متعلق ہے، دو منٹ پہلے افطار کر لے تو روزہ درست نہیں ہوگا، دو منٹ بعد سحری کھائیں تب بھی روزہ فاسد ہو جائے گا، حج بھی پانچ مقررہ ایام میں کیا جاتا ہے، اور حج کے تمام افعال کے لئے ایام و اوقات مقرر ہیں، زکوٰۃ کا تعلق بھی مال پر سال گذرنے سے ہے، عجیب بات ہے کہ جس دین میں وقت کا اتنا پاس و لحاظ ہو، اسی دین کے ماننے والوں میں وقت کی اس درجہ ناقدری اور ناحق شناسی یہ سب باتیں وعدہ خلافی میں داخل ہیں!

ہم جب کسی ملک کی شہریت اختیار کریں تو یہ اس ملک کے قوانین پر عمل کرنے کا عہد کرنا ہے، لہٰذا جب تک وہ قوانین اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں یا صریحاً ظلم پر مبنی

نہ ہو ان قوانین کا پابند رہنا ہم پر واجب ہے، اور اس کی رعایت نہ کرنا ملک کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی ہے، اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے — غرض، سماجی زندگی میں ہم ہر جگہ ایک عہد کے پابند ہیں، بعض عہد ہم اپنی زبان سے کرتے ہیں، بعض عہد ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے از خود ہم سے متعلق ہو جاتا ہے، بعض عہد کسی معاملہ کی وجہ سے شرعاً ہمارے ذمہ ہوتا ہے، اور بعض سماج کے عرف و رواج کی بنیاد پر بھی ہمارے لئے واجب العمل ہوتا ہے، ہم پر ان سب کی پاسداری ضروری ہے، مگر زندگی کے کتنے ہی مراحل میں ہم اپنے عہد و پیمان توڑتے ہیں، اور وعدے وفا نہیں کرتے، اس پر وقت نظر کے ساتھ غور کرنے اور وعدہ خلافی و بدعہدی کے گناہ سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۲۴/اگست ۲۰۰۱ء)

ایک مہلک بیماری جو خرید کی جاتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اصل میں انسان ہی کے نفع کے لئے ہے، بشرطیکہ انسان اس کا صحیح استعمال کرے، دنیا میں یقیناً ایسی چیزیں بھی ہیں کہ غلط طریقہ پر ان کا استعمال طرح طرح کی بیماریوں کا سبب اور ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا شعور بخشا ہے، اس سے بڑھ کر ناسمجھی کی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ انسان ایک شئی کے نقصان کو جانتے اور سمجھتے ہوئے پھر اسی کو استعمال کرتا جائے، اور اپنی گاڑھی کمائی ایک ایسی چیز پر خرچ کرے جو خود اس کو نقصان پہونچانے والی ہو۔

لیکن عجیب بات ہے کہ عملاً صورتِ حال یہی ہے کہ محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی دولت کا اچھا خاصا حصہ ہماری سوسائٹی میں بہت سے لوگ اسی طرح ضائع کرتے ہیں اور قیمتاً مہلک بیماریاں خرید کرتے ہیں، تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ صرف جاہل و ناخواندہ عوام ہی اس میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ پڑھے لکھے اصحابِ ذوق وادب اور اربابِ فکر ودانش بھی اس نادانشمندانہ عمل میں برابر کے شریک ہیں ــــ آپ کے لئے یقیناً یہ بات باعثِ حیرت ہوگی کہ آخر وہ کیا بیماری ہے جو مہلک اور تکلیف دہ بھی ہے، لیکن پیسے دے کر خرید کی جاتی ہے اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی اسے خرید کرتے ہیں، لیکن آپ حیرت زدہ نہ ہوں، یہ ایک واقعہ ہے اور آپ کو اپنے گرد وپیش، دوست احباب میں ہی اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گے!

یہ بیماری ہے ''تمباکو کا استعمال''، خواہ آپ پان کے ساتھ زردہ کے نام سے استعمال کریں، یا بیڑی اور سگریٹ کی صورت میں، آپ اپنے سینہ کو بھٹی بنالیں یا آپ

نسوار کی شکل میں ناک میں اس کا استعمال کریں یا دانت میں مل کر تسکین خاطر کا سامان کریں، یہ تمام صورتیں دراصل بیماریاں ہیں، اور ایسی بیماریوں کا پیش خیمہ ہیں جو انسان کو شدید قسم کے آلام میں مبتلا کرتی ہیں اور بالآخر زندگی کی نعمت سے محروم کر دیتی ہیں۔

یہ بلا مشرقی ممالک میں غالباً مغربی ممالک ہی سے درآمد ہوئی ہے، علامہ طحطاوی نے شیخ نجم غزی شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ دمشق میں پہلی دفعہ ۱۰۱۵ھ میں اس کا ظہور ہوا، (طحطاوی علی المراقی: ۳۶۴) اسی کے آگے پیچھے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں تمباکو کی آمد ہوئی، ہندوستان میں گو تمباکو بہت پہلے سے موجود رہا ہے، لیکن مسلم عہدِ حکومت میں اکبر کے دور میں حقوں کی صورت تمباکو نوشی کے رواج میں اضافہ ہوا، بعض محققین کا خیال ہے کہ تمباکو کا ورود اولاً جنوبی ہند ہی کے علاقہ میں ہوا ہے چنانچہ حکیم محمد عبداللہ رقمطراز ہیں:

> تمباکو ابتداء میں جنوبی ہند کی طرف سے آیا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اہلِ فرنگ ہند میں اسی جانب سے وارد ہوئے تھے، امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی ممبئی ہڑاونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں مرقوم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمال مشرقی ہند میں پہنچا۔ (خواص تمباکو: ۱۴،۱۳)

تمباکو اور سگریٹ کے نقصانات اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی جو محتاج بیان ہو، اب اس کے نقصانات مسلّمات میں سے ہیں، یوں تو یہ انسان کے پورے وجود کے لئے مضرت رساں ہیں، لیکن خاص کر پھیپھڑے کے لئے سم قاتل ہے، برطانیہ میں ۱۹۵۷ء میں ایک طبی بورڈ مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اکثر اموات کا سبب پھیپھڑے کا کینسر ہے۔ اور یہ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۱۹۶۲ء رپورٹ کے بموجب برطانیہ میں ایک سال میں ۲۳ ہزار انسان کی موت صرف پھیپھڑے کے کینسر سے ہوئی جس کا سبب سگریٹ کا استعمال تھا اس کے علاوہ منہ اور حلق کا کینسر اور دل کی بیماریاں تمباکو کے استعمال کی رہین منت ہیں، تازہ امریکی تحقیق کے مطابق تمباکو میں

شامل جزء ''پارین'' تمبا کونوشی کے ''جین'' کو کمزور کر کے کینسر کے جراثیم سے لڑنے کی جسمانی صلاحیت کو کمزور کر دیتا ہے، انسانی جسم میں اگر'' جین، پی، 53 ''صحت مند ہو تو وہ کینسر کے مقابلہ قوت مدافعت فراہم کرتا ہے اور یہی جین تمبا کونوشی سے اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے، حالیہ تحقیق کے مطابق امریکہ میں کینسر سے جو افراد موت کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سے دو تہائی افراد کی تمبا کونوشی، موٹاپا، بسیار خوری اور کاہلی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

(روزنامہ منصف ۱۴؍ جولائی، سائنس ٹکنالوجی ایڈیشن)

سگریٹ میں جو نکوٹین پائی جاتی ہے، خون پر اس کے سخت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں تمبا کو کا اثر انسان کی قوتِ ہضم پر بھی پڑتا ہے، آج کل تمبا کو خوری کی جو نئی صورتیں وجود میں آئی ہیں جس میں سب سے کثیر الاستعمال ''گٹکا'' ہے، یہ تو اور بھی زیادہ مضرت رساں ہے، اس سے مسوڑھوں اور منھ کے باہری حصہ کا کینسر ہوتا ہے اور گٹکا خوری کی وجہ سے کینسر پیدا ہونے کا تناسب تشویش ناک حد تک بہت زیادہ ہے، اسی لئے ہمارے ملک اور دنیا کے متعدد ملکوں میں سگریٹ کے پیکٹ پر قانوناً اس جملہ کے لکھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ''سگریٹ پینا صحت کے لئے نقصان دہ ہے،'' اور اب ہمارے ملک میں تمبا کو خوری اور تمبا کونوشی کو روکنے کے لئے بعض اور تدابیر کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تمبا کونوشی کو عام طور پر ناپسند کیا گیا ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی تمبا کونوشی کی ممانعت وارد ہوئی ہے، ''براہما پُران'' ہندو پرانوں میں سے ایک ہے، اس میں یہاں تک مذکور ہے کہ تمبا کونوشی کرنے والا گو براہمن کو ''دان'' (عطیہ) دیتا ہو پھر بھی وہ نرک (جہنم) ہی میں جائے گا، ''اسکند پران'' میں ہے کہ ''براہمن، چھتری اور دویش جو تمبا کو پیتے ہیں وہ چنڈال کی طرح ہیں''، یاگیہ ولکیہ سمرتی میں آٹھ قسم کی منشیات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک تمبا کو بھی ہے، سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ جی نے اپنے پیروؤں پر تمبا کو کے استعمال کو ممنوع قرار دیا تھا، (ہدایت، شمارہ: ۷، ۸۔ جے پور: ۳۲) اسی لئے گرد واروں میں تمبا کو رکھنے کو بھی سخت

خلاف احترام سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عرب میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمباکو غالباً نہیں پایا جاتا تھا، گو بعض روایات میں تمباکو کی مذمت وارد ہوئی ہے، لیکن یہ روایات حد درجہ ضعیف اور نامعتبر ہیں، مگر اسلام کی اصولی تعلیمات سے تمباکو کا حکم جانا جاسکتا ہے، اسلام نے بنیادی طور پر تمام نباتات کو حلال رکھا ہے، سوائے ان نباتات کے جو نشہ آور ہوں، مہلک ہوں یا صحت جسمانی کے لئے ضرر رساں ہوں اور ظاہر ہے کہ تمباکو کا جسم انسانی کے لئے مضر ہونا ایک مسلمہ اور متفقہ حقیقت ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ہر ''مسکر'' اور ''مفتر'' شی سے منع فرمایا ہے۔ نهى عن كل مسكر ومفتر (ابوداؤد، باب ما جاء فی السکر) مسکر سے مراد نشہ آور اشیاء ہے اور مفتر کا لفظ ''فتور'' سے ماخوذ ہے، فتور کے معنی کمزوری اور گراوٹ کے ہیں، علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ضعف و انکسار (نہایہ: ۴۰۸/۳) پس ''مفتر'' کا لفظ ہر ایسی چیز کو شامل ہے جو انسانی جسم اور صحت کو کمزوری سے دوچار کرتا ہو، اسی لئے علامہ محمد عبد الرؤف مناوی نے ''حشیش'' کو بھی مفتر اشیاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ زین الدین عراقی نے بھی اسی حدیث سے ''حشیش'' کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے، (دیکھئے: فیض القدیر: ۳۳۸/۶) اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مفتر اشیاء میں تمباکو بھی شامل ہے۔

تمباکو کے احکام کی بابت فقہاء اسلام کے درمیان اختلاف رائے ہے، بعض حضرات نے اس کی مضرتوں کی وجہ سے اسے بالکل ہی حرام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے بالکل ہی جائز اور مباح، کیونکہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے اور بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ مکروہ ہے، فقہاء شوافع میں علامہ نجم غزی اس کو حرام قرار دیتے ہیں، (طحطاوی: ۳۶۴) اور طحطاوی ہی نے بعض فقہاء حنفیہ سے اس کی کراہت نقل کی ہے، ہندوستان میں ماضی قریب کے اہلِ علم زیادہ تر اس کے جواز کے قائل ہیں، البتہ اس کو خلاف اولیٰ سمجھتے ہیں اور مسجد جاتے وقت منھ صاف کر کے جانے کی تلقین کرتے ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی، (فتاویٰ رشیدیہ: ۴۸۱) مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاوی: ۱۱۳/۴) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(فتاویٰ رضویہ:۱۱؍۴۵) اوران سے پہلے کے اہلِ علم میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (مجموعۃ الفتاویٰ :۱؍۲۲۹) کے فتاویٰ ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں، لیکن عرب علماء کا عام رجحان اس کے ناجائز ہونے کی طرف ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ابراہیم آل شیخ کے فتاویٰ اس سلسلہ میں بار بار سعودی عرب سے طبع ہو چکے ہیں، شیخ محمد ابراہیم کا فتویٰ بہت تفصیلی ہے، اورانہوں نے حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ چاروں دبستانِ فقہ کے اہلِ افتاء کے فتاویٰ اس کی حرمت وممانعت پر نقل کئے ہیں، یہی رائے علماء ہند میں مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کی ہے، (تحفۃ الاحوذی:۳؍۴۴) فقہی نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ تمباکو کا استعمال مکروہ ہے اور طبی اعتبار سے تمباکو کے استعمال کی جو صورت جتنی زیادہ مضرت رساں ہو، اس میں اسی قدر شدت کے ساتھ کراہت پائی جائے گی ،ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علماء ہند تک اس کے نقصانات اور مضرتوں کی تفصیلات پہنچ نہیں پائی تھیں ،انہوں نے تمباکو کے صرف ظاہری اور وقتی اثرات پر نگاہ رکھی اوراس کے اندرونی اور مستقل مضرتوں اور ہلاکت خیزیوں کے بارے میں ان کو کما حقہ علم نہیں ہو پایا، آج کل جو طبی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، اگر یہ ان کے سامنے موجود ہوتیں تو یقیناً ان کا رجحان اس بارے میں زیادہ شدید ہوتا۔

تمباکو نوشی کے نقصانات عالمِ اسلام میں جب کبھی بھی سامنے آئیں اس کو روکنے کی بھرپور تدابیر کی گئیں ،۱۰۳۲ھ میں سلطان احمد اوّل نے تمباکو کی تمام دکانیں بند کرنے کا حکم دیا، سلطان مراد چہارم کے بارے میں تو منقول ہے کہ وہ تمباکو نوشی کرنے والوں کے دونوں ہونٹ اورنسوار استعمال کرنے والے کی ناک کٹوا دیتا تھا، شریف مکہ سعود بن سعود نے ۱۱۴۶ھ میں برسرِ عام قہوہ خانوں اور بازاروں میں تمباکو نوشی کی ممانعت کا فرمان جاری کردیا تھا، سوڈان میں مہدی تمباکو استعمال کرنے والوں کو اسی ۸۰؍کوڑے اور ایک ہفتہ قید کی سزا دیتا، مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی قلمرو میں تمباکو نوشی پر سخت پابندی عائد کردی تھی، کم وبیش دوسری قوموں میں بھی ملک وقوم کے بہی خواہ حکمرانوں نے تمباکو نوشی کا سدِ باب کرنے کی بھی کوشش کی، انگلینڈ میں شاہ جاک اوّل نے سر والٹر رالی کو

جس نے انگلینڈ میں تمباکو کو فروغ دیا، گرفتار کر کے سزائے موت دی، سترہویں صدی کے اواخر تک روسی حکام تمباکو نوشوں کو سخت سزا دیا کرتے، پہلی دفعہ کوڑے لگاتے، دوسری بار پینے پر ناک کاٹ دیتے اور تیسری دفعہ میں سزائے موت دے دیتے۔

(ماہنامہ ہدایت: شمارہ: ۷: ۷صفحہ ۳۰)

گو تمباکو نوشی فطرتِ سلیمہ کے لئے متفقہ طور پر نہایت مذموم، ناپسندیدہ، قابلِ ترک اور لائق اجتناب شئی ہے، اس سے بچنا اور اگلی نسلوں کو اس سے بچانا ہم سب کا فریضہ ہے، بدقسمتی سے نوجوانوں کے لئے اب یہ ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، اگر ہم نے اپنی نسلوں کو اس بلاء بے درماں سے بچانے کی کوشش نہیں کی تو یہ ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

(۳۰/جولائی ......۱۹)

خودکشی ـــــ تشویش ناک سماجی مسئلہ

زندگی بہت بڑی نعمت ہے، ایسی نعمت جس کا کوئی بدل نہیں، جو جانے کے بعد واپس نہیں آتی، انسان یہ نعمت اپنی محنت اور کدو کاوش سے حاصل نہیں کرتا بلکہ کائنات کے رب کا عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو علم و تحقیق کی اتنی ترقی کے باوجود ایک سربستہ راز ہے، علم وسائنس کی ترقی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ انسان اپنے ایک ایک عضو کے بارے میں جاننے لگا ہے کہ وہ اس کا حجم کتنا ہے؟ سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک اس نے بدن کے ایک ایک انگ اور رگ وریشہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے، لیکن آج بھی عقل اس گرہ کو کھولنے سے عاجز ہے اور قدرت کے رازِ سربستہ سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہے کہ آخر روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ جسم میں کیوں کر آتی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ پھر کس طرح چپ چاپ جسم کو داغِ فراق دے کر چلی جاتی ہے کہ نہ کوئی ہاتھ ہے جو اسے تھام سکے، نہ کوئی حساس سے حساس مشینی آلات ہیں، جو اس کو گرفتار کر سکیں یا کم سے کم اس کی حقیقت کا ادراک ہی کر لیں، انسان کی یہ مجبوری اور علمی بے بسی خدا کا یقین دلاتی ہے اور ایمان میں تازگی پیدا کرتی ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ ﷺ سے روح (زندگی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ ﷺ فرمادیں کہ یہ میرے رب کے حکم اور فرمان سے عبارت ہے۔ ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی ''۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

پس انسان اپنی ''زندگی'' کا خود مالک نہیں ہے بلکہ امین ہے، زندگی اس نے حاصل نہیں کی ہے، بلکہ اسے عطا فرمائی گئی ہے، یہ اس کے پاس خالق کائنات کی امانت ہے اور ممکن حد تک اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بیماری کا علاج کرنے کی تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ نے اپنا علاج کرایا اور اسی لئے علماء نے

لکھا ہے کہ علاج کرانا توکل کے خلاف نہیں، کیوں کہ توکل اور قناعت کے اعلیٰ درجہ پر حضراتِ انبیاء کرام فائز تھے اور وہ علاج بھی کراتے تھے اور حفظانِ صحت کے اُصول کی رعایت بھی کرتے تھے۔

کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت یا زندگی کے لئے مضرت رساں ہو اور انسانی زندگی کو خطرہ میں ڈال سکتا ہو، جائز نہیں، آپ ﷺ نے ہر ایسی چیز کے کھانے سے منع فرمایا، جو نشہ آور یا جسم کو نقصان پہنچانے والی (مفتر) ہو۔ ''مفتر'' یعنی جسم کے لئے مضرت رساں چیزوں کے کھانے کی ممانعت تو ظاہر ہے کہ صحت اور زندگی کے تحفظ کے لئے ہے، لیکن نشہ آور چیزوں سے منع کرنے کی وجہ جہاں یہ ہے کہ اس سے انسان کی عقل وفہم پر زد پڑتی ہے اور بہت سے اخلاقی مفاسد اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہیں یہ بھی ہے کہ یہ ایک میٹھا زہر ہے جو موت کی طرف زندگی کے سفر کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔

اسی لئے فقہاء نے نباتات میں ایسی چیزوں کے کھانے کو ناجائز قرار دیا ہے، جو زہر کے قبیل سے ہو اور انسانی زندگی کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتی ہو۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۰۶/۳)

اسلام تو اللہ کی عبادت اور بندگی میں بھی ایسے غلو کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی صحت کو برباد کر لے اور جان جوکھم میں ڈالے، عہد نبوی ﷺ میں بعض حضرات نے یہ معمول بنالیا تھا کہ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے اور دن میں روزہ رہتے، ایک دوسرے صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا: تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے اپنے وجود کا بھی حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، اس لئے کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سونے کا بھی اہتمام کرو، حضور ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیا اور تصویب فرمائی، (بخاری: ۲۶۴/۱) آپ ﷺ نے جان بچانے کے لئے دوا کے طور پر ایسی چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو اصلاً ناجائز اور حرام ہیں۔ (بخاری: ۴۶/۱)

یہ اور اس طرح کی اسلامی تعلیمات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جیسے اسلام نے دوسروں کی جان بچانے کا حکم دیا ہے، اسی طرح انسان پر یہ بات بھی واجب ہے کہ وہ

بہ حد امکان اپنی جان کی حفاظت کرے، کیوں کہ زندگی اس کے پاس خدا کی امانت ہے اور امانت کی حفاظت اسلامی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، اسی لئے اسلام کی نگاہ میں ''خود کشی'' بہت بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے، ایسا گناہ جو اس کو دنیا سے بھی محروم کرتا ہے اور آخرت سے بھی، خود قرآن مجید نے خود کشی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ''لا تقتلوا انفسکم'' (النساء:۲۹) پیغمبر اسلام ﷺ کے متعدد ارشادات ہیں جن میں نہایت سختی اور تاکید کے ساتھ خود کشی کو منع فرمایا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خود کشی کی وہ جہنم کی آگ میں بھی اسی طرح ہمیشہ گرتا رہے گا اور جس شخص نے لوہے کی ہتھیار سے خود کو ہلاک کیا وہ دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے پیٹ میں ہتھیار گھونپتا رہے گا، (بخاری) ایک اور روایت میں ہے کہ گلا گھونٹ کر خود کشی کرنے والا جہنم میں ہمیشہ گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے والا دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔ (بخاری)

حضرت طفیل بن عمر دوسیؓ کے ساتھ ایک اور صاحب نے مدینہ ہجرت کی، وہ دوسرے صاحب بیمار پڑ گئے، تکلیف کی شدت کے باعث ان سے صبر نہ ہو سکا اور ایک ہتھیار سے اپنی اُنگلیوں کے جوڑ کاٹ لئے، رگیں کٹ گئیں اور خون اتنا بہہ گیا کہ انتقال ہو گیا، حضرت طفیلؓ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ وہ بہتر حالت میں ہیں، لیکن ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، حضرت طفیلؓ نے دریافت کیا کہ آپؓ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ان صاحب نے کہا: اللہ نے ہجرت کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا، لیکن میرے ہاتھوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑ لیا ہے، میں اسے درست نہیں کرسکتا، حضرت طفیل نے یہ خواب حضور ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے دعاء فرمائی کہ بارالہا! ان کے ہاتھوں کو بھی معاف فرمادے! (مسلم عن جابرؓ)

صحابیِ رسول حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایک شخص کو زخم تھا، وہ تکلیف برداشت نہ کرسکا، چھری لی اور اس سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا، خون تھم نہ سکا اور موت واقع ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے اپنی

ذات کے معاملہ میں مجھ پر سبقت کرنے کی کوشش کی، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔ (بخاری و مسلم) رسول اللہ ﷺ رحمت مجسم تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت جابر بن سمرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے خودکشی کر لی، تو آپ ﷺ نے اس پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، (ترمذی) اسی لئے ایک جلیل القدر فقیہ اور محدث امام احمدؒ کا خیال ہے کہ خودکشی کرنے والے شخص پر عام لوگ تو نمازِ جنازہ پڑھیں گے، لیکن امام المسلمین نماز جنازہ نہیں پڑھے گا۔ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خودکشی اسلام کی نگاہ میں کتنا سنگین جرم ہے؟ یہ دراصل زندگی کے مسائل اور مشکلات سے راہِ فرار اختیار کرنا ہے اور آزمائشوں اور اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ نکلنے کی ایک غیر قانونی اور ایک غیر انسانی تدبیر ہے، بدقسمتی سے ایمان سے محرومی یا کمزوری اور اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی کے باعث اس وقت پوری دنیا میں خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کو انسان کا نجی حق تسلیم کیا جاتا ہے، جو لوگ طویل عرصہ سے بیمار ہوں، ان کو بعض مغربی ملکوں میں مہلک انجکشن لگوا کر مر جانے کی قانونی اجازت حاصل ہو گئی ہے، بلکہ ان کے ورثاء اور رشتہ داروں کو بھی اس کی اجازت دے دی گئی ہے اور اس کو ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔

چند سالوں سے ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خودکشی کے واقعات میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور اس سال معاشی حالات کی ناموافقت کی وجہ سے آندھرا پردیش میں تقریباً پانچ سو کاشت کاروں کی خودکشی نے اخبارات و رسائل میں جلی عنوان کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور ریاستی اسمبلی سے لے کر پالیمنٹ تک اس کی گونج سنی جا رہی ہے، پڑوس کی ریاست اڑیسہ میں بھی کسانوں کی خودکشی کے واقعات بکثرت پیش آئے ہیں، ہفتہ میں چار پانچ دن میں اخبارات میں ایسی خبریں مل ہی جاتی ہیں، جن میں خواتین کی خودسوزی اور خودکشی کا ذکر ہوتا ہے، یہ واقعات عام طور پر سسرال والوں کی زیادتی اور پیسوں کے نہ ختم ہونے والے مطالبات کی وجہ سے پیش آتے ہیں، ایسے ماں باپ کی خودکشی بھی انوکھی

بات نہ رہی جو اپنے افلاس وغربت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے سے قاصر ہیں اور ظالم سماج نے ان کو سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا کیا ہوا ہے، کچھ واقعات ایسے مقروضوں کے بھی پیش آتے ہیں کہ قرض، سود اور سود در سود نے ان کی ہمت توڑ رکھی ہے۔

مقامِ افسوس بھی ہے اور لائق حیرت بھی کہ بہت سے مسلمان بھی اب اس کا شکار ہو رہے ہیں، لائق حیرت اس لئے کہ خودکشی بنیادی طور پر ایمان کی کمزوری یا اس سے محرومی کی وجہ سے کی جاتی ہے، جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو، یقین کرتا ہو کہ خدا دشواریوں کی سیاہ رات سے آسانی اور امید کی صبح نو پیدا کرسکتا ہے، جو شخص تقدیر پر ایمان رکھتا ہو کہ خوش حالی اور تنگ دستی اور آرام وتکلیف اللہ ہی کی طرف سے ہے، صبر وقناعت انسان کا فرض ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ زندگی کے مصائب سے تھکے ہوئے مسافروں کے لئے وہاں راحت وآرام ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ کی پکڑ اور عذاب، وہ کیسے مشکل وقتوں میں خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھنے یا بارگاہِ ربانی میں دست سوال پھیلانے اور خدا کی رحمت سے اُمید رکھنے کے بجائے مایوس ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کرلے گا؟؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ خودکشی کے اخلاقی اور سماجی نقصانات لوگوں کو بتائے جائیں، سماج میں لوگوں کی تربیت کی جائے کہ وہ تنگدستوں اور مقروضوں کے ساتھ نرمی اور تعاون کا سلوک کریں، گھر اور خاندان میں محبت اور پیار کی فضا قائم کریں اور باہر سے آنے والی بہو کو محبت کا تحفہ دیں، رسم ورواج کی جن زنجیروں نے سماج کو زخمی کیا ہوا ہے، ان کو کاٹنے کی کوشش کریں، شادی، بیاہ کے مرحلوں کو آسان بنائیں اور جو لوگ ذہنی تناؤ سے دوچار ہوں اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہوں، ان میں جینے اور مسائل ومشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کریں، کہ بقول حضرت کلیم:

سلگنا اور شئی ہے جل کر مرجانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ پروانوں سے کیا ہوگا

(۲۴؍ جولائی ۱۹۹۸ء)

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

۱۲؍ مارچ ۱۹۹۸ء کے روزنامہ ''منصف'' میں شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حیدرآباد شہر میں ''سیمن بینک'' قائم ہو چکا ہے، جہاں مردوں سے مادۂ تولید حاصل کیا جاتا ہے اور اولاد کی خواہش مند بانجھ خواتین کو فروخت کیا جاتا ہے اور ان کے رحم میں اس کو پہنچایا جاتا ہے، ڈاکٹر مادۂ تولید حاصل کرنے میں طبی نقطۂ نظر سے ہر طرح کی احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں، جو ہر حیات فروخت کرنے والوں کو ایک بار ۱۲۰؍ روپے قیمت ادا کی جاتی ہے، خبر کے مطابق اب تک اس بینک کو پچاس مستقل عطیہ دہندگان حاصل ہو چکے ہیں اور تیس خواتین اس سے حاملہ ہونے کی آرزو پوری کر چکی ہیں۔

حیدرآباد کے لئے تو یہ خبر غالباً ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے، لیکن ہندوستان میں مغربی تہذیب کے باب الداخلہ ممبئی میں عرصہ پہلے سے ایسے بینک قائم ہیں اور ممکن ہے کہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے کام کر رہے ہوں، عرصہ پہلے جانوروں کے لئے اس کا تجربہ کیا گیا تھا اور اب جانوروں پر حمل و تولید کا یہ طریقہ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ اب مختلف جانوروں کے اختلاط اور ان کے ذریعہ ایسی نسل کے حصول کا بھی کامیاب تجربہ کیا جا رہا ہے، جس میں دونوں صنف کے جانوروں کی خصوصیات جمع ہوں۔

حیوانات میں نر کا مادۂ تولید مادہ کے رحم تک پہنچایا جائے، اس میں اخلاقی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں، یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی جائز ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں نسب کی پہچان اور والدین اور اولاد کی شناخت نہیں رکھی، اس لئے اگر ان کا نسب مجہول ہو اور شناخت باقی نہ رہے تو کوئی حرج نہیں، اگر دو الگ الگ جنس کے نر و مادہ کا اختلاط ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خچر

موجود تھے، جو گدھے اور گھوڑی کے اختلاط سے پیدا ہوتے تھے، ان کی سواری کی جاتی تھی اور خود آپ ﷺ نے بھی خچر کی سواری فرمائی، یہ شرعی اعتبار سے اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

اگر نر و مادہ حلال ہوں تو ان سے پیدا ہونے والا بچہ بھی حلال ہوگا اور اس کا کھانا جائز و درست ہوگا، کیوں کہ حیوانات کی شناخت ان کی ماں ہی سے ہے۔ اگر ایک حلال اور ایک حرام ہو تو فقہاء کے ایک گروہ کا خیال ہے ''مادہ'' حلال ہو تو حلال اور مادہ حرام ہو تو حرام تصور کیا جائے، دوسرا خیال ہے کہ اس کی عادات و خصائل پر فیصلہ ہوگا، کیوں کہ ظاہری طور پر یہی ایک ذریعہ ہے، جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس جانور کی زیادہ مماثلت کس سے ہے؟ مثلاً کتے اور بکری کے اختلاط سے بچہ پیدا ہو، یہ سامنے کے دانت سے کھائے اور کتے کی طرح بھونکے تو اسے کتا شمار کیا جائے گا اور اگر کنارے کے دانتوں سے کھائے اور اس کی آواز بکری سے مماثلت رکھتی ہو، تو حلال ہوگا، تیسری رائے ہے کہ ایسے جانور کو حرام تصور کیا جائے گا، کیوں کہ اسلامی قانون میں اس بات کو بطورِ اُصول مانا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں حلال و حرام کے پہلو جمع ہوں تو حرام ہونے کی ترجیح دی جائے گی، **اذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام** (الاشباہ والنظائر: ۱۰۹) حقیقت یہ ہے کہ یہی تیسری رائے ان میں سے قوی، شریعت کے مزاج سے قریب اور شریعت کے اُصول و قواعد سے ہم آہنگ ہے۔

عقل و شعور کی خصوصی صلاحیت کے سوا اگر انسان اور دوسرے جانوروں کے ان اوصاف کا تقابل کیا جائے جو بحیثیت حیوان انسان میں پائے جاتے ہیں، تو بڑی مماثلت نظر آتی ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھو کر محسوس کرنے کی صلاحیت انسان میں بھی ہے اور دوسرے جانوروں میں بھی، خورد و نوش کی ضرورت اور ہضم کا نظام بھی دونوں کے ساتھ ہے، توالد و تناسل کے لئے نر و مادہ کا اختلاط اور تولیدی نظام میں بھی بڑی حد تک یکسانیت ہے، لیکن جو چیز انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ عفت و عصمت اور نسب کی شناخت ہے، یہی چیز انسانی معاشرہ میں خاندان کو وجود میں لاتی ہے، نکاح کے ذریعہ مرد و عورت میں قانونی ارتباط بہم پہنچتا ہے، پھر اسی سے رشتے بنتے ہیں اور قرابت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

ہر شریف سماج میں عفت وعصمت اور نسب کی پہچان کو باقی رکھنے کو نہایت ضرورت اور اہم تسلیم کیا گیا ہے اور اسی نسبت سے بے عفتی اور بے نسبی کو نفرت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، عیسائیت میں حضرت مریم کی اور ہندو مذہب میں سیتا کی عفت وعصمت کو اخلاقی نمونہ مانا گیا ہے، اسلام ــــ جو سب سے محفوظ مذہب ہے اور جس کی تعلیمات قیامت تک کے لئے مشعل ہدایت ہیں ــــ نے شرک کے بعد سب سے زیادہ جس گناہ کی مذمت کی ہے، وہ زنا ہے اور اس جرم کی اتنی سخت سزا مقرر کی ہے کہ ارتداد کی سزا بھی اس درجہ شدید نہیں، پھر غور کرو تو اسلام کا پورا قانونِ معاشرت دو باتوں پر مبنی ہے: عفت وعصمت کی حفاظت اور زوجین میں محبت ومودت کی برقراری، طلاق وخلع اور شوہر کے ظلم سے نجات پانے کے لئے فسخ وتفریق کی گنجائش، قانونِ عدت، پردہ وحجاب کے احکام اور غیر محرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی ممانعت، ان سب کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان حیوانات کی طرح بے نسب نہ ہو جائے اور جانوروں کی طرح شہوت رانی پر کمر بستہ نہ ہو۔

انسانی تاریخ میں متعدد ایسے ادوار گزرے ہیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو حیوان کی سطح سے بھی پست کر لیا ہے اور شاید شیطان بھی ان کی اخلاقی پستی دیکھ کر عرق آلود ہوا ہوگا، ایران میں ۴۷ء میں ''مزدک'' پیدا ہوا، جس نے عورتوں کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح مشترک اور تمام انسانوں کے لئے حلال قرار دیا اور ماں بہن کی تمیز بھی اٹھادی، (الملل والنحل للشہرستانی: ۲۴۳/۱ط: بیروت) طبری کا بیان ہے کہ اس مفسدانہ فلسفہ نے ایسا زور پکڑا کہ جو چاہتا اور جس کے گھر میں چاہتا گھس جاتا، نہ باپ اپنی اولاد کو پہچان سکتا تھا اور نہ اولاد اپنے باپ کو۔

(تاریخ طبری: ۸۸/۲)

یونان حالاں کہ تہذیب وثقافت کا مرکز رہا ہے، لیکن یونان کے زوال میں اخلاقی پستی نے بڑا کردار ادا کیا ہے، اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ پروفیسر لیکی کے بقول'' بڑے بڑے حکماء وفلاسفہ طوائف سے غیر مخفی راہ ورسم رکھتے اور ان کے گرد ہر وقت مشاہیر شعراء، ماہرین فنونِ لطیفہ، مؤرخین اور فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا اور اکثر ان کا مکان علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا''، (تاریخ اخلاق یورپ: ۲۵۲،۵۳) یہاں تک کہ اس زمانہ میں سقراط جیسا فلسفی وحکیم

اپنے زمانہ کی مشہور طوائف تھوڈونا کو اس کی پیشہ عصمت فروشی کی متعلق رونق وترقی کا مشورہ دیتا نظر آیا ہے۔ (حوالۂ سابق:۲۴۱)

موجودہ مغربی تہذیب دراصل اسی مزد کی فلسفہ کی نقیب اور وارث ہے، چنانچہ عرصہ پہلے کے اعداد وشمار کے مطابق امریکہ میں ہر سال اوسطاً ۱۰ر لاکھ حرامی بچے اسقاط کے ذریعہ ضائع کردیئے جاتے ہیں، پچاس فی صد کنواری لڑکیاں اور ۲۶ر فیصد شادی شدہ عورتیں زنا میں ملوث ہیں اور کم از کم ہر پانچ میں ایک بچہ صحیح النسب نہیں ہوتا، (ضبط ولادت:۴۲۔۴۰) اور یہ تو بہت پرانے اعداد وشمار ہیں، اب تو کہا جاتا ہے کہ دفاتر فارموں میں صرف ماں کے نام کا خانہ ہوتا ہے، باپ کے نام کا خانہ نہیں ہوتا، انسانیت کی ایسی تذلیل ورسوائی شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوئی ہو۔ **فیا اسفاہ و یا عجباہ !**

ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اجنبی مرد وعورت کے مادۂ تولید کو بارآور کرنا یا اجنبی اور غیر معروف مردوں کے مادۂ تولید کو عورت کے رحم میں منتقل کرکے اس کو ماں بنانا کھلی ہوئی بدکاری اور انسانوں کو حیوان کی سطح پر اُتارنا ہے، انسان کو نسب اور اپنی شناخت سے محروم کردینا اخلاق و شرافت کے بالکل مغائر ہے اور شاید ہی کوئی مذہب ہو جو اس کو جائز رکھتا ہو، اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا وآخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں کہ وہ اپنے پانی یعنی مادۂ تولید سے دوسرے کی کھیتی یعنی بیوی کے علاوہ کسی اور خاتون کے رحم کو سیراب کرے۔ **لایحل لامرء یومن باللہ والیوم الآخر ان یسقی ماءہ زرع غیرہ.** (ترمذی)

ماں بننے کی خواہش ہر چند کہ عورتوں کی ایک فطری خواہش ہے، لیکن یہ خود اس جوڑے کے لئے یا انسانی سماج کے لئے ایسی ضرورت نہیں کہ جس کے لئے ایسے فعل کی اجازت دی جائے، جو نہ مذہب کی بارگاہ میں قابل قبول ہو اور نہ شرافت وتہذیب کے ایوان میں قابل تسلیم، یہ دراصل مشرق کی مذہبی روایات پر شب خوں مارنے کی کوشش ہے اور اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی بات کچھ اور نہیں ہوسکتی کہ توالد وتناسل کے اس غیر انسانی طریقہ پر ایک بھی صدائے احتجاج بلند نہ ہو۔ (۱۷ر اپریل:۱۹۹۸ء)

ستی کا واقعہ۔ ملک وقوم کے لئے داغِ ندامت!

یوں تو آج کل ہمارے ملک میں اکیسویں صدی کا بہت چرچا ہے، راجیو گاندھی نے ملک کو عصری تقاضوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل کرنے کا نعرہ دیا تھا، لیکن آج تمام ہی قومی قائدین نے اس کو اپنا نعرہ بنالیا ہے، بعض تو ہم پرست لوگ تو ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ گویا اکیسویں صدی شروع ہونے کے بعد شاید کچھ غیر معمولی اور عجوبہ واقعات ظہور میں آئیں گے، بعض لوگوں کے یہاں یہ بحث جاری ہے کہ ۲۰۰۰ء سے اس صدی کا آغاز ہوگا یا ایک سال بعد، اس صدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ یہ سائنس اور ٹکنالوجی، علم وتحقیق اور علم وتحقیق کے وسیلہ سے خوشحالی اور اقتصادی ترقی کی صدی ہوگی، لیکن کیا واقعی ہم نے فکری اور عملی اعتبار سے ترقی کا سفر جاری رکھا ہے یا ہم فکر ونظر کی تاریکی اور تہذیب وتمدن کی پستی کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے؟

ہم نے یقیناً نیوکلیر بم بنالئے ہیں، دور دراز تک مار کرنے والے میزائیل کو وجود بخشا ہے، سمندر کی تہوں میں اتر کر جنگ وجدال کی صلاحیت حاصل کی ہے، سائنس اور تحقیق کے دوسرے شعبوں میں بھی ہم نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں، لیکن ایک محدود طبقہ تک ہی ہماری کامیابیاں محدود ہیں، ملک کے عام باشندے اور دیہات وقریہ جات میں رہنے والے ہم وطنوں تک ہم علم کی روشنی پہنچانے اور تہذیب و تمدن کی شمع جلانے میں ناکام رہے ہیں، اس کی ایک مثال اکیسوں ی صدی کی دہلیز پر بھی ''ستی'' کے واقعات کا پیش آنا ہے، ۱۱ر نومبر کو اتر پردیش میں موضع ست پردان جو ''مہوا'' کے قریب واقع ہے، میں ''ستی'' کا واقعہ پیش آیا ہے، ذرائع ابلاغ کی

رپورٹ کے مطابق چرن شاہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اور مذکورہ تاریخ کو آخری رسومات انجام دی گئیں، چرن شاہ نے دلہن کا لباس زیب تن کیا، بن سنور اور سج دھج کر آئی اور اپنے شوہر کی شعلہ بار چتا پر کود گئی، لوگ اس تماشا کو دیکھتے رہے لیکن اسے بچانے اور روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، چرن شاہ کی لاش اس قدر جل بھن کر راکھ بن گئی کہ پوسٹ مارٹم بھی نہیں کیا جا سکا۔

حالانکہ پولس نے اسی واقعہ کے بعد اس علاقہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تا کہ یہ ستی کی ترغیب کا باعث نہ بنے، لیکن لوگوں نے ایک نہیں سنی اور ۱۴ر نومبر کی اخباری اطلاع کے مطابق اس وقت تک ۳۰ر ہزار ہندو انتہائی عقیدت کے ساتھ اس مقام کا درشن کر چکے ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے، لوگ اس جگہ ایک مندر بنانا چاہتے ہیں، ہندو عورتیں انتہائی عقیدت کے ساتھ ”ستی استھل“ پر پھول اور سیندور چڑھانے کے لئے آرہی ہیں، دیہاتیوں کے بیان کے مطابق یہ علاقہ ”ستی“ کی رسم کے لئے مشہور ہے اور گذشتہ پچاس برسوں میں یہ چوتھا واقعہ ہے، ستی کے مقام پر پوجا کی جاتی ہے اور ہر جمعرات کو میلے لگائے جاتے ہیں۔

سائنس وٹکنالوجی اور علم وتحقیق کے اس عہد میں بھی اس طرح کے واقعات کا پیش آنا نہایت شرمناک بات ہے، مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے ہندوستان میں ”ستی“ کا رواج برہمنوں کو چھوڑ کر دوسری ذات کے افراد میں عام تھا، مسلمانوں نے اس بدبختانہ رسم کو مٹانے کی بڑی کوششیں کیں، پھر انگریزوں کے عہد میں ستی کو ممنوع قرار دینے کے لئے مستقل قانون بنا، لیکن اس کے باوجود ملک کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان وغیرہ میں ستی کے شدہ شدہ واقعات پیش آتے رہے ہیں، اور بار بار کے روک تھام کے باوجود ابھی بھی اکا دکا ایسے انسانیت سوز واقعات پیش آجاتے ہیں، ”ستی“ محض ایک رسم نہیں بلکہ ہندو فکر اور قانون معاشرت سے اس کا رشتہ جڑا ہوا ہے، عورتوں کے بارے میں ہندو تصور یہ ہے کہ اس کا اپنا مستقل وجود نہیں بلکہ وہ مرد ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اور اس کی حیثیت ملکیت اور جائیداد کی ہے، بیوی گویا شوہر کی جائیداد ہے، اسی

لئے ہندو سماج میں عورتوں کو کوئی میراث نہیں دی جاتی تھی، لڑکیوں کو اپنے نکاح کے بارے میں کوئی اختیار نہیں تھا اور ان کی مرضی کو دخل دیئے بغیر اولیاء ان کی شادی کر دیا کرتے تھے، نکاح کے بعد طلاق اور علاحدگی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اور شوہر کے گذر جانے کے بعد بھی ان کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں تھی، نکاح بیوگاں ہندو سماج میں ایسی ناجائز بات تھی کہ ایک ساتھ بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے مسلمان بھی اسے معیوب سمجھنے لگے، ستی کی رسم بھی غالباً اسی فکر سے جڑی ہوئی ہے کہ چونکہ وہ اپنے شوہر ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اس لئے اسے اپنے شوہر ہی کے ساتھ نذرِ آتش ہو جانا چاہئے، ستی ہونے کو ہندو سماج میں شوہر کے ساتھ کمالِ وفاداری تصور کیا جاتا تھا، اور اسی لئے اس عمل کو تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس طرح کے واقعات ہمیں اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی، ان کی عقل و فطرت سے ہم آہنگی اور تمام طبقوں کے ساتھ عادلانہ اور منصفانہ رویہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اسلام نے مردوں اور عورتوں کے وجود کو ''مستقل'' تسلیم کیا ہے، (نساء: ۱۲۴، الغافر: ۴۰) عورتوں کو میراث میں حقدار بنایا ہے، بیوی، بیٹیاں، ماں ان قرابت داروں میں ہیں جو بہر صورت میراث کی مستحق ہیں، (النساء: ۱۲-۱۱) اگر زوجین میں نباہ نہ ہو سکے تو طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۳۶) بیوہ عورتوں کے لئے نہ صرف نکاح کو جائز قرار دیا گیا، بلکہ اس کی ترغیب دی گئی، (النور: ۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے جن خواتین سے نکاح فرمایا ان میں اکثر بیوہ عورتیں تھیں، عورت کو اپنی جائیداد میں تصرف کا کامل حق دیا گیا، (النساء: ۱۹) عورتوں کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا اور نکاح کو ایک باعزت معاہدہ قرار دینا جس میں شوہر و بیوی معاملہ کے دو فریق ہیں نہ کہ ایک مالک اور دوسرا مملوک یا ایک صاحبِ سامان اور دوسرا سامان و جائیداد، یہ مرد و عورت کے تعلق کا ایسا صاف ستھرا اور واضح تصور ہے جس میں ستی کی کوئی گنجائش نہیں اور شوہر کے ساتھ اپنے آپ کو نذرِ آتش کر دینے کا کوئی محرک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو بھائیوں کو اسلام کا احسان شناس ہونا چاہئے کہ آج عورتوں

کے بارے میں ہندوستان میں جو کچھ قانونی اصلاحات ہوئی ہیں، وہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہیں چاہے عورتوں کے لئے حقِ میراث کا مسئلہ ہو یا ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے طلاق کی اجازت کا یا بیوہ عورتوں کے لئے نکاح کی اجازت کا اور نکاح میں لڑکی کی رضامندی و خوشنودی کا، یہ سب اسلام کے متوازن اور عادلانہ قانونِ معاشرت کا نتیجہ ہے، اسی لئے تعلیمی پسماندگی اور اس کی وجہ سے در آنے والی معاشی گراوٹ کے باوجود مسلمانوں میں آج بھی اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے، اگر ہمیں سائنس وٹکنالوجی اور علم وتحقیق کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی بلندی اور تہذیب وتمدن کی درخشانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھنا ہے اور ایک صالح اور باضمیر سماج کی تعمیر کرنی ہے تو ضرورت ہے کہ ہم ایک سماجی نظام کی حیثیت سے اسلام کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں کہ جب تک فکر کی اصلاح نہ ہوگی اور قلب وذہن کی دنیا میں انقلاب نہ آئے گا اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے، جو یقیناً قوم اور ملک کے لئے داغِ ندامت اور نشانِ عار ہوں گے!

(۱۶ر نومبر ۱۹۹۹ء)

دختر کشی ـــــ عہد جدید میں

ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کفر و جاہلیت میں مبتلا اور بتوں کے پرستار تھے، خود اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، وہ میرے پکارنے سے بہت خوش ہوتی تھی، جب بھی بلاتا دوڑ کر آتی، ایک دن میں نے اسے بلایا، وہ میرے پیچھے پیچھے آئی، میں اسے ساتھ لے کر چلتا رہا، یہاں کہ میں ایک محلّہ کے کنویں کے پاس آیا، جو کچھ زیادہ دور نہیں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک دیا اور آخری بات جو میں نے اس کی زبان سے سنی وہ یہ تھی میرے ابو! میرے ابو! ـ یہ سن کر آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوا، اتنا روئے کہ ریش مبارک بھی آنسو سے تر ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمانۂ کفر کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اب نئے سرے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو، (سنن دارمی: ۱۳۱) اسلام سے پہلے عرب میں اس طرح کے ظالمانہ عمل کا ارتکاب کوئی شاذ و نادر بات نہ تھی، بلکہ کثرت سے ایسے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔

اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اولاد کشی اور خاص کر دختر کشی کی مذمت کی ہے، (الانعام: ۱٦) لوگ فقر و افلاس کے اندیشے سے قتل اولاد کے مرتکب ہوا کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کم سے کم دو جگہ بھوک اور فاقہ کشی کے خوف سے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی روزی ہمارے ذمہ ہے نہ کہ تمہارے ذمہ، (الاسرا: ۴، الانعام: ۱۹) ایک بار آپ ﷺ نے اس سوال پر کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ اول نمبر پر شرک کا نام لیا، پھر والدین کی نافرمانی کا اور اس کے بعد اس خوف سے اولاد کو مار ڈالنے کا کہ اس کے کھانے کا کیا نظم ہوگا۔ (بخاری)

کچھ لوگ وہ تھے جو قتل اولاد کو قربانی تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس عمل کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکیں گے، عربوں میں بھی یہ تصور عام تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی مذمت بھی کی ہے، (الانعام:۱۶) خود آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی تھی، جب نذر پوری کرنے کی نوبت آئی، تو اپنے دس بیٹوں کو لے کر کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور فال نکالا کہ قربانی کے لئے کس کا نام نکلتا ہے؟ اتفاق کہ سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کا نام نکلا، یہ وہی عبداللہ تھے جن کے صلب میں نبوت کا ماہِ تمام چھپا ہوا تھا، عبدالمطلب اس قربانی کے لئے پوری طرح تیار تھے، لیکن قریش نے بڑی خوشامدیں کیں کہ اگر بیٹے کی قربانی کا رواج عام ہوگیا تو اس سے ہم کمزور ہو جائیں گے، چنانچہ زمانہ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق پانسے نکالے گئے اور بالآخر عبد اللہ کے بدلہ سو اونٹ ذبح کئے، (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:۱۵۴۱) بچے کی قربانی کے نذر کے بعض اور واقعات بھی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک خاتون نے اس قسم کی نذر کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ اس کا کفارہ ادا کردو، (موطا امام مالک، باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ) اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کے یہاں ایسی قربانی کوئی نادر واقعہ نہ تھی اور یہ کچھ عربوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی انسانی قربانی کا رواج رہا ہے، ہندوستان میں بھی دیویوں و دیوتاؤں پر انسانی چڑھاوے کا رواج تھا اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ باپ نے اپنی ہی اولاد کو بلی چڑھادی۔

تاہم فقر وافلاس کی وجہ سے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے قتل اولاد کے واقعات تو اکا دکا ہوتے تھے، لیکن ''دختر کشی'' کا رواج عربوں میں بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے لئے ایسا شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا کہ سن کر اور پڑھ کر آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ حضرت قیس بن عاصمؓ نے بارگاہ نبوی ﷺ میں اعتراف کیا کہ وہ اسلام سے پہلے اپنی آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کر چکے ہیں، بلکہ ایک روایت میں بارہ تیرہ لڑکیوں کا ذکر ہے۔ (مجمع الزوائد:۱۳۴۷)

دراصل عرب اپنے گھر میں داماد لانے کو شرم و عار کی بات سمجھتے تھے، اسی لئے بیٹی کی پیدائش کا نام سنتے ہی مارے غصہ کے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا تھا، اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے تھے، یا تو وہ اس متاعِ رسوائی کو اپنے پاس رکھے یا اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کردے، (النحل : ۷) ہندوستان میں بھی راجپوتوں اور بعض دوسری طاقتور قوموں میں لڑکیوں کے دفن کردینے کا رواج تھا اور شوہروں کے ساتھ بیوی کا ستی ہو جانا بھی غالباً اسی تصور کا ایک حصہ تھا۔

گو اسلام سے پہلے بھی اور خود عرب سماج میں بھی بعض ایسے شریف النفس اور نیک طبیعت لوگ موجود تھے جو بے گناہ نومولود بچیوں کو حاصل کر لیتے اور پرورش کر کے ان کو جوان کرتے تھے، پھر اگر ان کے والدین چاہتے تو بچیاں ان کو واپس کر دیتے، ورنہ خود ہی ان کی پرورش کرتے رہتے، بخاری میں اس سلسلہ میں خاص طور پر زید بن عمرو بن نفیل کا ذکر آیا ہے، (بخاری: ۵۴۰۱) لیکن اس کی حیثیت محض شخصی کوششوں کی تھی اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر محض دو چار دس جانوں کے تحفظ کا باعث بن سکتی تھیں، یہ کوششیں اس مقصد میں ذرا بھی بار آور نہیں ہو پائیں کہ عربوں کے ذہن سے شرم و عار کے اس احساس کو مٹا سکیں اور ان کو سمجھا سکیں کہ جو شخص اپنی بیٹی کسی کے حوالہ کرتا ہے وہ ذلیل و حقیر نہیں بلکہ وہ اپنے داماد کا محسن ہے، اور ہر مرد کو اپنی بیوی کے والدین کا منت شناس اور احسان مند ہونا چاہئے۔

لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ رحمت مجسم بن کر تشریف لائے اور کفر و جاہلیت اور اوہام و خرافات کی تہہ در تہہ تاریکی میں ان پر ہدایت کا چراغ روشن کیا، تو آپ ﷺ نے عربوں کے ذہن سے اس تصور ہی کو مٹا دینے میں کامیابی حاصل کی، آپ ﷺ نے لڑکیوں کو ''زحمت'' کے بجائے ''رحمت'' قرار دیا، ان کی پرورش کو آخرت کی نجات کا ذریعہ بتایا، سماج میں قریب قریب مردوں کے مساوی حقوق ان کو عطا فرمائے اور ہر طرح کے اعزاز و احترام سے اس مظلوم طبقہ کو سرفراز کیا، خواتین سے تو آپ ﷺ باضابطہ اس بات کی بیعت ہی لیا کرتے تھے کہ وہ قتل اولاد کا ارتکاب نہیں کریں گی۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یا تو وہ وقت تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ رکھنا اور ان کی

پرورش کرنا بھی باعث عار تصور کرتے تھے، یا پھر وہ وقت آیا کہ حضرت امامہ بنت حمزہؓ کی پرورش کے لئے تین تین صحابہ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ مدعی تھے، مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں آیا اور آپ ﷺ کو اس سلسلہ میں فیصلہ کرنا پڑا، پھر مسلمان جہاں کہیں گئے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگوں کے لئے ایک پیام رحمت ثابت ہوئے، ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے ہی ستی کی رسم ختم کی اور بیوہ عورتوں کے لئے تحفظ کا سروسامان کیا۔

ہمارا یہ دور علم و تحقیق اور اکتشاف کا دور ہے، سائنسی ترقیوں نے بہت سی ایسی باتوں کو ''واقعہ'' بنا کر دکھا دیا ہے، جن کو نصف صدی پہلے ناممکن تصور کیا جاتا تھا، علم و تحقیق سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ اکثر دو دھاری تلوار کا درجہ رکھتی ہے، اگر اس کا صحیح استعمال ہو تو بہت نافع، اور غلط استعمال ہو تو اسی درجہ مضرت رساں، ایسی ہی سائنسی تحقیقات میں ایک جنین کے بارے میں قبل از وقت حاصل ہونے والی معلومات ہیں، ایسی معلومات پر مبنی ٹسٹ کے لئے ''سونو گرافی مشین'' ایجاد پذیر ہوئی ہے، اس مشین کے ذریعہ جنین کی جنبش معلوم کرنا ممکن ہے، چنانچہ چند سو روپے خرچ کر کے (Sex Dermination Test) کرایا جا سکتا ہے اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟

ایک معمولی اندازہ کے مطابق اس ٹسٹ پر مبنی اطلاعات کی روشنی میں روزانہ پانچ تا چھ سو لڑکیاں اس عالم رنگ و بو میں آنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہیں، یہ قتل دشمنوں اور غیر سماجی عناصر یا غنڈوں کے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ شفیق باپ اور ''ممتا سے معمور ماں'' کے ہاتھوں ہوتا ہے اور خاندان کے بزرگوں اور خیر خواہوں کا مشورہ بھی اس میں پوری طرح شریک رہتا ہے، گو انسانی حقوق اور خواتین کی مختلف تنظیموں کے احتجاج اور مطالبہ پر قانوناً ایسے ٹسٹ کو منع کر دیا گیا ہے، لیکن جب تک انداز فکر میں تبدیلی نہ آئے، قانون شکنی کو کب روکا جا سکے گا؟

اصل میں لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عورت کا وجود سماج کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر مرد کا، اگر عورتوں کی شرح پیدائش گھٹتی چلی جائے اور مردوں کا تناسب بڑھتا چلا جائے تو اس سے ایسے سماجی مفاسد پیدا ہوں گے کہ جن کا تصور بھی دشوار ہے، خواتین پر مجرمانہ دست درازی میں اضافہ ہوگا، زنا اور اغواء کے واقعات بڑھیں گے، گھروں کا ماحول

خراب ہوگا، اخلاقی انارکی پیدا ہوگی اور چوں کہ اصل میں افزائش نسل کا مدار عورت ہی کا وجود ہے اس لئے مطلق شرح پیدائش کم ہوتی جائے گی اور اس کے نتیجے میں افرادی وسائل کی قلت کا سامنا ہوگا، انسان کو خاندانی نظام کے سکون سے محرومی کو گوارا کرنا پڑے گا اور اس سے ایسی بے حیائی اور بے شرمی کو راہ ملے گی، جو تصور سے بھی ماوراء ہے، خود ہندوستان میں بعض قبائلی اقوام میں عورتوں کی شرح پیدائش میں کمی کی وجہ سے کئی کئی مردوں کی ''مشترک بیوی'' کا شرم ناک رواج موجود ہے، اسی سے دختر کشی کے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم صرف والدین کو دختر کشی کی اس ''جاہلیت جدیدہ'' کا مجرم قرار دیں، تو شاید انصاف نہ ہو، پورا سماج اس کا مجرم ہے، وہ ظالم سماج جو اپنے لڑکوں کو بازار کے سامان کی طرح اُونچی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین سے ان کی رگ گلو کا آخری قطرۂ خون بھی وصول کر لے، جس کو حرص وطمع نے سیم وزر کا ایسا پیاسا بنا دیا ہے کہ جیسے کوئی سگ گزیدہ مریض، اور جس کی بے رحمی وشقاوت اور سنگدلی پر شاید درندے بھی شرماتے ہوں، جب تک ہم اس اصل مرض کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہوں، دختر کشی کی اس نئی لہر کو روک نہیں سکتے۔

قرآن مجید نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کی بابت عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ خدا کا دربارِ انصاف لگا ہوگا، خدا پوری شان قہاری کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا، ناحق قتل کر دی جانے والی پھولوں کی طرح معصوم بے گناہ لڑکیاں لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر یہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں؟ بای ذنب قتلت ؟ (التکویر:۹) شاید اس وقت ان لڑکیوں کے قاتل ماں باپ بھی کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، وہ ڈاکٹر اور معالج بھی جن کا فریضہ بہ حد امکان زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ زندگی کا خاتمہ، اور شاید وہ پورا سماج بھی جو بالواسطہ ان بے گناہوں کے قتل میں شریک وسہیم ہے ــــــ

(۲۷ر اگست ۱۹۹۸ء)

ایک اہم سماجی مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن چیزوں کا ضرورت مند بنایا ہے، ان میں سے ایک نکاح بھی ہے، نکاح نسلِ انسانی کی افزائش کا ذریعہ، انسان کی پاکبازی اور عفت وعصمت کی حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ نکاح ہی ہے، اور یہ نوعِ انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، دینِ حق کا منشا یہی ہے کہ انسان کی فطری ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے دائرہ میں رہ کر پورا کیا جائے، اسی لئے انبیاء کے ذریعہ آنے والی ہر شریعت میں نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی، انبیاء جو سب سے برگزیدہ گروہ انسانی ہیں، اور جن کا ایک ایک عمل انسانیت کے لئے اسوہ ہے، انہوں نے نہ صرف نکاح کیا، بلکہ بہتوں نے ایک سے زائد نکاح کئے، حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حواءؑ کے جوڑے کا ذکر بائیبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام وغیرہ کی ازواجِ مطہرات کا قرآن اور قرآن سے پہلے کی مذہبی کتابوں میں واضح تذکرہ ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی نہ صرف متعدد نکاح کئے، بلکہ نکاح کو اپنی سنت قرار دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: **من سنتي النكاح** نکاح میرے طریقوں میں سے ہے، (مجمع الزوائد: ۲۵۲/۴) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پانچ چیزوں کو آپ ﷺ نے انبیاء کی مشترکہ سنتیں قرار دیا، ان میں ایک نکاح ہے، (حوالۂ سابق: ۲۵۳/۴) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے، وہ مجھ میں سے نہیں ہے، **من كان موسرا لأن ينكح ثم لم ينكح فليس مني** (مجمع الزوائد: ۲۵۱/۴) جو لوگ بلا عذر تجرد کی زندگی گذارتے ہوں،

آپ ﷺ نے ان کو بدترین لوگ قرار دیا، شرار کم عزابکم (مجمع الزوائد: ۴/۲۵۰)
خود قرآن مجید میں بھی نکاح کی تلقین کی گئی، ارشاد ہے:

"وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم، ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله، والله واسع علیم" (النور : ......)

اور تم اپنے میں سے غیر شادی شدہ لوگوں کا نکاح کردو، اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے بھی نیک لوگوں کا، اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے اور جاننے والے ہیں۔

اس آیت میں نکاح کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اس ذہنی گرہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی گئی ہے جو عام طور پر نکاح کے بارے میں پائی جاتی ہے، کہ اگر نکاح کردیا جائے تو اس نکاح سے جو خاندان وجود میں آئے گا، اس کی ضروریات کیسے پوری کی جائیں گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی وجہ سے انہیں "غنی" سے سرفراز فرمائے گا، اور ان کی رزق میں وسعت پیدا کرے گا، چنانچہ حضرت ابو ہریرۃ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر حق ہے، ان میں ایک وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو پاک دامن رکھنے کی غرض سے نکاح کرے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۸۷)

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے نام پر کچھ مذہبی گروہوں نے نکاح سے بے نیازی برتی، جسے "رہبانیت" کہتے ہیں، تو قرآن مجید نے اسے پسند نہیں کیا، بلکہ اسے ایک من گھڑت فعل قرار دیا، رهبانية ابتدعوها (الحدید: ۲۷) جب اللہ کی بندگی کے لئے یکسوئی کی نیت سے بھی تجرد کی زندگی کو پسند نہیں فرمایا گیا، تو اس لئے تجرد اختیار کرنا اور نکاح میں تاخیر کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے کہ اس کے معاشی حالات اور بہتر ہو جائیں؟ مگر افسوس کہ مادیت کی پرستش اور خوب سے خوب تر معاشی معیار کی طلب کے نتیجہ میں اس وقت نکاح میں تاخیر کا رجحان عام ہوگیا ہے، بعض نوجوان اصل شباب کو گذارنے کے بعد

جب عمر میں ڈھلاؤ شروع ہوتا ہے تو نکاح کرتے ہیں، یہ نہایت ہی غلط رجحان ہے، اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں، یہ نہ صرف اخلاقی اعتبار سے بلکہ طبی اعتبار سے بھی مضرت سے خالی نہیں، جب وقت بچوں کی تربیت کا آتا ہے تو والدین پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، یوں تو موت کا کوئی وقت متعین نہیں، لیکن عمر طبعی پر بھی موت آئے تو وہ پرورش کے محتاج بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخت سفر باندھ لیتا ہے، اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دیر سے نکاح کرنے کے واقعات زیادہ تر تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال خاندان میں پیش آتے ہیں، اس لئے اس کو معاشی مفلوک الحالی کا نتیجہ قرار دینا قرین انصاف نہیں۔

اس سے زیادہ اہم مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور نکاح کے بعد تجرد سے دوچار ہونے والے مردوں کے نکاح کا مسئلہ ہے، ہندو تہذیب میں عورتوں کے مطلقہ ہونے کا تو تصور ہی نہیں تھا، کیونکہ عورت جب ایک دفعہ کسی مرد سے نکاح کے بندھن میں منسلک ہو جاتی تو پھر اسے بہر قیمت اسی کی زوجیت میں رہنا پڑتا، خواہ یہ رشتہ محبت وسکون کی شبنم کی بجائے نفرت کی آگ میں کیوں نہ تبدیل ہو گیا ہو، لیکن جو عورتیں بیوہ ہو جاتیں اور اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ نذر آتش کئے جانے سے بچ رہتیں، ان کا بھی حال کچھ بہتر نہیں تھا، انہیں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی، عربوں میں گو ایسا رواج نہیں تھا، لیکن بعض واقعات ایسے پیش آتے تھے، کہ شوہر یا اس کے ورثہ غیرت کی وجہ سے یا مال کی حرص میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو نکاح نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام نے اس رویہ کو پسند نہیں کیا، اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بن بیوی مردوں اور بن شوہر عورتوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا، ایک موقع پر مطلقہ عورتوں کے اولیاء سے فرمایا گیا کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہیں تو رکاوٹ نہ بنو، ’’**فلا تعضلوا هن ان ينكحن ازواجهن اذا تراضوا بينهم بالمعروف**‘‘ (البقرہ: ۲۳۲) پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارے لئے پاک وصاف زندگی گذارنے کا نسخہ ہے،’’**ذالكم ازكى لكم واطهر**‘‘ (البقرہ: ۲۳۲) اس میں اس بات کی طرف اشارہ

ہے کہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا نکاح سماج کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، جو لوگ ازدواجی زندگی کے تجربہ سے گذر چکے ہوں، ان کا مجرد رہنا سماج کے لئے زیادہ نقصان دہ اور بگاڑ کا سبب ثابت ہوسکتا ہے، اس نصیحتِ ربانی میں غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ایک حقیت ہے کہ ہمارے سماج میں مطلقہ اور بیوہ خواتین کے نکاح کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، بلکہ بچوں کی پرورش کے نام پر اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے. یہ صحیح سوچ نہیں ہے، عورت ہر مرحلہ میں مرد کی رفاقت و نگہداشت کی محتاج ہوتی ہے، شادی سے پہلے باپ اس کا محافظ ہوتا ہے، شادی کے بعد اس کا شوہر، اور اخیر عمر میں اس کی اولاد، اس لئے شوہر ایک عورت کے لئے سکون اور نگہداشت کا ذریعہ ہے، وہ جس طاقت کے ساتھ اپنی ضروریات کا مطالبہ شوہر سے کرسکتی ہے، نہ بال بچوں سے کرسکتی ہے، نہ بھائی بہنوں سے، اور نہ شادی کے بعد اپنے والدین سے، اسے ادھوری زندگی گذارنی پڑتی ہے، اس لئے یہ قطعاً نامنصفانہ بات ہے، کہ اس کی بیوگی اور تجرد کے دائمی غم کو اس کا رفیقِ حیات بنادیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے جن ازواجِ مطہرات سے نکاح فرمایا، ان میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں، حضرت زینبؓ مطلقہ تھیں، اور باقی امہات المومنین بیوہ تھیں، خود رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما ابولہب کے بیٹے عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں، ابولہب کے کہنے پر ان بدبختوں نے طلاق دے دی، آپ ﷺ نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنیؓ کے عقد میں دیا، ہندوستان میں بہت پہلے سے بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے کی رسم چلی آتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس خراب رسم پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے، اور اپنے اہلِ خاندان کو اس بُری رسم کے ختم کرنے کی وصیت کی ہے، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے خلاف مہم چلائی اور خود اپنے خاندان سے اس کی ابتداء کی، اس طرح مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے نکاح کے معیوب ہونے کا جو ذہن سماج میں پیدا ہوگیا تھا، بحمد اللہ وہ کیفیت تو باقی نہیں رہی، لیکن عملاً اب بھی لوگ اس

سے اجتناب ہی برتتے ہیں، اور بعض عورتیں تو بیس پچیس سال کی عمر میں بیوہ ہو کر پوری زندگی اسی حال میں گذار دیتی ہیں، یہ نہایت ہی قبیح بات اور ظالمانہ رسم ہے، اور پوری قوت سے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

جن مردوں کی بیویوں کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے دوبارہ نکاح کرنے کو بھی پسند نہیں کیا جاتا، بعض لوگ تو سن رسیدہ لوگوں کے بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کرنے کو حرص و ہوس سمجھتے ہیں، اور خود بال بچے والد کے نکاح کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، یہ بھی ناروا سوچ ہے، مرد جس قدر جوانی میں بیوی کا محتاج ہوتا ہے، بڑھاپے میں اس سے کچھ کم ضرورت مند نہیں ہوتا، کیونکہ بعض خدمت ایسی ہے جسے بیٹے، بیٹیاں، بہو انجام نہیں دے سکتے، بیوی ہی کر سکتی ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ بہ وقت ضرورت باپ کا نکاح بھی اولاد پر اس کا ایک حق ہے، کیوں کہ یہ اس کی خدمت میں شامل ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ نکاح میں عمر کے لحاظ سے توازن ہونا چاہئے۔

یہ ایک اہم سماجی مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ خطباء منبروں سے اور سماجی اصلاح کی تنظیمیں اپنے پلیٹ فارم سے ان قبیح رسموں کے ازالہ کی فکر کریں، کہ یہ بے سہارا خواتین کو سہارا فراہم کرنے کی نیک کوشش ہوگی!!

(۲۵ر جنوری ۲۰۰۲ء)

جہیز کی ظالمانہ رسم اور ہماری ذمہ داریاں

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اس دنیا میں بعثت کا مقصد جہاں مخلوق کو اس کے خالق سے جوڑنا تھا، وہیں یہ بھی تھا کہ انسان نے اپنے آپ پر خود ساختہ رسم و رواج کا جو بوجھ رکھ لیا ہے، اس کو اس سے آزاد کیا جائے "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" (الاعراف:۱۵۷) چنانچہ اسلام سے پہلے لوگوں نے بہ طور خود جو مشکل قوانین اپنے آپ پر مسلط کر لئے تھے، قرآن نے ان کو دور فرمایا، اور ایسے احکام دیئے جو انسانی مصلحت سے ہم آہنگ بھی ہیں اور ان کے لئے قابلِ برداشت بھی، اسی لئے قرآن نے بہ طور اصول یہ بات کہہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی قوت اور گنجائش کے لحاظ سے ہی احکام کا مکلّف بناتے ہیں "لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (البقرۃ:۲۸۶) نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ خدا یہ نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو حرج اور تنگی میں مبتلا کرے، بلکہ وہ تو سہولت و آسانی اور کشائش و فراخی چاہتا ہے "يُرِيدُ اللّٰه بكم اليسر وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرۃ:۲۸۵)۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے عبادات کو آسان رکھا ہے، اور اللہ کی بندگی کے سیدھے سادھے بے خرچ کے اور کم خرچ کے طریقے رکھے ہیں، معاملات کو اللہ نے اس سے بھی زیادہ آسان رکھا ہے، اور جیسے اللہ نے اپنے تکوینی نظام میں ایسی چیزوں کو جو مخلوق کے لئے ناگزیر ہیں، وافر مقدار میں رکھا ہے، اور بے قیمت و محنت فراہم کی ہیں، جیسے پانی اور ہوا، اسی طرح نظامِ شریعت میں بھی انسانی زندگی کی فطری ضروریات کو آسان رکھا گیا ہے، ان ہی ضروریات میں ایک نکاح ہے، نکاح انسان کی فطری ضرورت ہے، جس سے

ایک طرف نسل انسانی کی افزائش متعلق ہے، اور دوسری طرف اخلاق و کردار اور قلب و نگاہ کی حفاظت، اسی لئے اسلام میں نکاح کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، آپ ﷺ نے نوجوانوں کو تلقین فرمائی کہ بہ شرطِ قدرت وہ جلد نکاح کر لیا کریں، لڑکیوں کے اولیاء سے فرمایا کہ مناسب رشتے ہاتھ آجائے تو شادی میں تاخیر نہ کی جائے، آپ ﷺ نے نکاح کو اپنی اور انبیاء سابقین کی سنت قرار دیا، اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا۔

نکاح کو آسان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حلال کو آسان کیا جائے تو حرام سے بچنا بھی آسان ہوگا، اور اگر حلال کو دشوار کر دیا جائے تو حرام سے بچنا بھی دشوار ہوگا، چنانچہ جن ممالک میں نکاح کی شرح کم ہے، اور تجرد کی زندگی گذارنے والوں کا اوسط زیادہ ہے، وہاں زنا اور فواحش کی کثرت ہے، وقتی سکون حاصل کرنے کے لئے منشیات کا استعمال عام ہے، خاندانی نظام بکھر چکا ہے، اور برائیاں ایک سیلابِ بلا بن کر سماج کے رگ و ریشہ میں سما گئی ہیں، اس لئے کوئی بھی ایسی بات جو نکاح کا راستہ روکنے والی ہو اور لڑکوں یا لڑکیوں کو تجرد کی زندگی پر مجبور کرتی ہو سماج کے لئے سمِ قاتل ہے۔

آج جو چیزیں شادی بیاہ کے معاملہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، ان میں سرفہرست جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ ہے، اس رواج نے سماج کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے، اس کا سب سے شرمناک پہلو محض جہیز کے لئے شادی شدہ عورتوں کو جلانے اور ہلاک کرنے کے واقعات ہیں، یکم اگست ۱۹۹۱ء کی بی، بی، سی کے ایک نشریہ کے مطابق ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۹ء میں گیارہ ہزار سے زیادہ ہندوستان میں جہیزی اموات کے واقعات ہوئے ہیں، ۱۹۹۴ء میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہر دن جہیز کے مسئلہ کی وجہ سے سترہ اموات واقع ہوئی ہیں، ۱۹۹۷ء میں چھ ہزار سے زیادہ جہیزی اموات کے واقعات ہوئے، ۱۹۴۷ء سے چالیس سال کے عرصہ میں بہتر ہزار نوجوان عورتیں ہندوستان میں جہیز کی نزاع کی وجہ سے مار ڈالی گئیں۔ (دیکھئے: ماہنامہ ہدایت، جے پور، جلد: ۸، شمارہ: ۹) صفحہ: ۲۵-۲۶)

جہیز کے اس ناروا رسم و رواج نے جسم فروشی کو بھی بڑھاوا دیا ہے، ایک سروے کے مطابق ملک میں گیارہ سو ایسے علاقے ہیں جو جسم فروش کے لئے بدنام ہیں، تئیس لاکھ

عورتیں پیشہ ورانہ طور پر اس بُرائی میں مبتلا ہیں، اوران کے بچوں کی تعداد اکیاون لاکھ ہے، سروے کے مطابق ہر سال پچیس ہزار لڑکیاں اس حیا سوز پیشہ میں داخل ہورہی ہیں، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی ۱۶ / اپریل ۱۹۹۹ء) ____ اسی طرح لڑکیوں کی قبل از پیدائش قتل کا سلسلہ بھی روز افزوں ہے، اسی لئے جنوری ۱۹۹۶ء میں دورانِ حمل جنس کی شناخت کی غرض سے الٹرا سونوگرافی پر پابندی عائد کی گئی، لیکن کتنے ہی جوڑے ہیں، جو اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ ہندوستان میں ہر سال ایک کروڑ بارہ لاکھ اسقاطِ حمل کے واقعات ہوتے ہیں، اوران واقعات میں ہر سال بیس ہزار عورتیں موت کا شکار ہوجاتی ہیں، (اسلامی نظامِ معاشرت اور جہیز کی رسم، عمر حیات غوری، صفحہ ۵۲) یہ اسقاطِ حمل کے واقعات زیادہ تر ناجائز حمل اور قبل از وقت لڑکیوں کی شناخت سے متعلق ہیں۔

راجستھان کے اضلاع باڑمیر، جسلمیر نیز ملک کے بعض دوسرے علاقوں میں پیدائش کے بعد بھی ہفتہ دس روز کے اندر لڑکیوں کو زہر کھلا کر یا کسی اور طرح مار ڈالنے کا رواج ہے، چنانچہ راجستھان کے ضلع باڑمیر کے دیوارا گاؤں میں ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۹۹۹ء میں وہاں ایک سو دس برسوں کے بعد ایک بارات آئی، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۴ / اکتوبر ۱۹۹۹ء) ____ کیا اس جدید جاہلیت نے قدیم جاہلیت کو بھی شرمسار نہیں کردیا ہے،؟

یہ فحاشی، تجرد کا رجحان، اور لڑکیوں کے قتل وغیرہ کے واقعات کے لئے ایک اہم محرک یہی جہیز اور گھوڑے جوڑے کی بلا ہے، ایک طرف ملک میں غریبوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور دوسری طرف ایک طبقہ دادِ عیش دینے اور اس عیش کے اظہار و نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں ہے، بمبئی کے وان کھیڑے اسٹیڈیم میں ۱۹۹۰ء میں ایک تقریب شادی منعقد ہوئی، جس میں تیس ہزار لوگوں نے شرکت کی، اور بتایا جاتا ہے کہ ہیرے جواہرات کے ایک تاجر نے اسی بمبئی میں اپنی بیٹی کی شادی پر تیس کرروڑ روپے خرچ کئے، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۱۶ / اکتوبر ۱۹۹۸ء) ممتاز قائد جے للیتا کے منہ بولے بیٹے کی شادی کی مدہوش کردینے والی تقریبات اور روشنی اور آواز کا سیلاب شاید ابھی تک لوگوں کو یاد ہو، بعض ایسی شادیاں

بھی اخبارات کے صفحات پر آچکی ہیں جن میں پورا ہوائی جہاز شادی کے لئے ریزرو کیا گیا ___ ایک ایسا ملک جس میں لاکھوں انسان بھوکوں پیٹ سو جاتے ہوں، اور ہر روز ہزاروں مریض اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس لئے جان دے دیتے ہوں کہ ان کے پاس دوا وعلاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں، ایسے سماج میں ایک طبقہ کا اس طرح داد عیش دینا انسانیت کے ساتھ کیسا مذاق ہے؟؟

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اسلام نے نکاح میں تمام مالی ذمہ داریاں مردوں پر رکھی ہیں، مہر اس کے ذمہ ہے، ولیمہ اسے کرنا ہے، بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری اس پر ہے، بچوں کی پرورش کا بوجھ اسے برداشت کرنا ہے، خود کمانا ہے، اور پورے گھر کی ضروریات پوری کرنا ہے، اسی باعث تو اللہ تعالیٰ نے مرد کو ''قوام'' یعنی سربراہِ خاندان بنایا ہے، اس لئے مرد کا عورت سے نکاح کے موقع پر یا نکاح کے بعد کچھ لینا درحقیقت ننگ وعار کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک سے زیادہ نکاح فرمائے، اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کیا، اور آپ کے جاں نثار رفقاء کے بہت سے نکاح آپ کے سامنے ہوئے، لیکن نہ جہیز، اور نہ مردوں کی طرف سے کوئی مطالبہ، حضرت خدیجہؓ کا حضرت زینبؓ کو سونے کا ہار دینے کا ذکر ملتا ہے، لیکن ایک تو یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے، دوسرے اس کی صراحت نہیں کہ نکاح کے وقت ہی ہار دیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے لئے کچھ گھریلو اشیاء بستر، تکیے، مشکیزہ وغیرہ بنوائے، لیکن حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے، کہ یہ سب کچھ خود حضرت علی ؓ کی زرہ فروخت کر کے اسی سے مہیا کیا گیا تھا، (دیکھئے: شرح مواہب: ۲/۴-۳) مشہور ہے کہ اردو زبان میں سیرت کی پہلی کتاب مفتی عنایت احمد کاکوری کی ''تواریخ حبیب اللہ'' ہے، انہوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت علی ؓ کے زرہ کی قیمت میں سے کچھ آپ ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو دیا کہ خوشبو خرید کر لائیں، اور باقی حضرت ام سلمہؓ کو کہ حضرت فاطمہؓ کے لئے گھر کی ضروریات خرید کی جائیں، (تواریخ حبیب اللہ: ۴۴) فقہاء کے یہاں قریب قریب صراحت ملتی ہے کہ نکاح کے موقع پر عورت سے کوئی مال حاصل کرنا ''رشوت'' کے حکم میں

ہے،اور رشوت کا گناہ اور حکم ظاہر ہے کہ اس کا لینا بھی حرام ہے،اور ضرورت شدیدہ کے بغیر اس کا دینا بھی ،اور لے لیا ہو تو واپس کرنا واجب ہے،رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے،تو کس قدر محرومی کی بات ہے کہ ایک سنت نبوی کو انجام دیتے ہوئے انسان اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا طوق بھی اپنے گلے میں ڈال لے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی نہایت سنگین مسئلہ ہے،اور سنگین تر بنتا جارہا ہے،کم سے کم مسلمانوں کو دین عدل اور شریعت عادلہ کے حامل ہونے کی حیثیت سے اس کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا چاہئے،اور سماج کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنی چاہئے ، نہ یہ کہ وہ خود ظلم و جور کے اس سمندر میں کود پڑیں اور دوسری قوموں کی اس ظالمانہ رسم کو اپنے سماج میں لے آئیں، جیسے ایک زمانہ میں بعض بزرگوں نے نکاح بیوگان کی تحریک چلائی تھی ، کیونکہ مسلمان ہندو سماج سے متاثر ہوکر بیوہ عورتوں کے نکاح سے گریز کرنے لگے تھے،اسی طرح آج بھی ایک ایسی مہم کی ضرورت ہے، جو رسم جہیز کو مٹانے کے لئے برپا کی جائے ،اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ انسانی بنیادوں پر تمام اقوام میں اس پیغام کو لے کر پہونچا جائے۔

اس سلسلہ میں دو طبقہ کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں،ایک تو علماء اور مشائخ کی، کہ وہ ایسی تقریبات میں شرکت سے گریز کریں،جن میں لین دین کی بنیاد پر نکاح کیا گیا ہو،اور غالباً ان کا یہ فعل منشا شریعت کے بھی مطابق ہوگا، دوسرے قوم کا متمول اور صاحب ثروت طبقہ جو اسراف اور فضول خرچی پر قادر ہے،اس کے باوجود وہ شادی بیاہ کی تقریب کو سادگی سے انجام دے،تو فضول خرچی کی یہ دوڑ کم ہوگی، اور متوسط اور غریب گھرانوں کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا سال ڈیڑھ سال پہلے شہر کے ایک بڑے مسلم صنعت کار نے سادہ طریقہ پر اپنی لڑکی کی شادی کی رسم انجام دی، اخبارات نے بھی اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا،اور مختلف حلقوں پر اس کا اچھا اثر پڑا ___ کاش! ہم سماج کی اس مجبوری کو محسوس کریں اور حقائق کی کڑواہٹوں کو نہ صرف گوارا کریں، بلکہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے حالات میں کچھ انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ (۲۷/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

لڑکوں کی تجارت

دنیا میں کتنی ہی چیزوں کی تجارت ہوا کرتی ہے، معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی ہیرے موتی سے لے کر ریت اور مٹی کے ڈھیر بلکہ غلاظتوں تک کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری ہے، کسی زمانہ میں انسان کی بھی تجارت ہوا کرتی تھی، اب بھی سنا ہے کہ افریقہ کے بعض غریب ممالک میں انسان خریدے اور بیچے جاتے ہیں، گاہے گاہے ہندوستان میں بھی ایسی خبریں منظر عام پر آجاتی ہیں، کہ فلاں مقام پر غریب اور فاقہ کش ماں باپ نے اپنے جگر کے ٹکروں کو کچھ پیسوں کی عوض فروخت کر دیا، یقیناً خون جگر پلا کر اپنے بچوں کی پرورش کرنے والے ماں باپ ایسے موقعوں پر خون کے آنسو روتے، اور اشکِ حسرت ان بچوں کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے رخصت کرتے ہوں گے۔

لیکن انسانی تجارت کی ایک اور صورت ہے، جو اس وقت سماج کے مہذب لوگوں کے درمیان رائج ہے، جس میں انسان اپنے لڑکوں کو آپ فروخت کرتا ہے، اور فروخت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حسرت و افسوس کے آنسو نہیں بلکہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں، دل حسرت و یاس کی تپش سے ابلتا نہیں بلکہ حسین آرزوؤں کے تصور سے اچھلتا اور کودتا ہے، یہ عجب منڈی ہے جہاں پڑھے لکھے، اہلِ دانش، اصحابِ ثروت، اعلیٰ عہدوں پر فائز خوشی خوشی اپنے لڑکوں کا سودا لے کر آتے ہیں، اور اس کی تعلیم، معاشی امکانات، خاندانی پس منظر، یہاں تک کہ شکل و صورت اور آباء و اجداد کی شرافت کی دہائی دے کر ڈاک لگاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت کے خواستگار ہوتے ہیں، انہیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرنے اور ان کی جوانی کی قیمت لگانے میں نہ کوئی شرم ہوتی ہے، نہ کوئی عار۔

آپ سوچیں گے یہ کون سی منڈی ہے؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے لڑکوں کو بیچ بھی سکتا ہے، کہیں انسانوں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا عہد غلامی پھر واپس آ گیا ہے؟؟ ــــ لیکن آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، ہمارا پورا سماج انسانی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے، ہر گھر میں ایک دوکان ہے، اور ہر خاندان میں کچھ تاجر اور کچھ گاہک ہیں، ــــ کیا لڑکی والوں سے گھوڑے، جوڑے کے نام پر رقم وصول کرنا، ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا، اپنے مدعوین کو ان کے سر تھوپ دینا اور ان سے منھ مانگا کھانا طلب کرنا، تجارت اور اپنے لڑکے کی قیمت لگانا نہیں ہے؟ قیمت روپیوں میں بھی ادا کی جاتی ہے، سامان واسباب کے ذریعہ بھی، اور ہوٹلوں میں شکم پروری کے ذریعہ بھی، یہ سب قیمت کے مختلف عنوان اور الگ الگ انداز ہیں، لڑکا اور اس کے والدین ان تمام طریقوں سے لڑکے کی قیمت وصول کرتے ہیں، اور اس کی جوانی کا منھ مانگا دام پاتے ہیں، اس کے تجارت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی ماں باپ سے مرد وعورت دونوں کو پیدا کیا ہے، جیسے مردوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی عورتوں کے، بلکہ قرآن نے کہا ہے کہ اصولی طور پر مرد وعورت دونوں حقوق میں برابر ہیں "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ" (البقرۃ: ۲۲۸) ــــ البتہ صلاحیتوں کے تفاوت کے اعتبار سے تقسیم کار ہے، اور بعض ذمہ داریوں میں مرد وعورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، مرد کو سربراہِ خاندان قرار دیا گیا "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ" (النساء: ۳۴) ــــ اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فوقیت دی گئی، لیکن یہ فوقیت محض مرد ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مردانہ فرائض اور بحیثیت سربراہ خاندان خرچ کرنے کی وجہ سے ہے، "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (البقرۃ: ۲۲۸)

غرض مرد کو جو فضیلت و برتری دی گئی ہے وہ اس وجہ سے کہ وہی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے، اسی لئے کسب معاش کی ذمہ داری مرد سے متعلق کی گئی "وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (الجمعۃ: ۱۰) اور امور خانہ داری کو عورتوں سے متعلق کیا گیا، اور ان سے کہا گیا کہ وہ گھر میں رہا کریں "وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ" (الاحزاب: ۳۳) کہ ان کی عزت

شمع خانہ بن کر رہنے میں ہے، نہ کہ شمع محفل بننے میں، اسی لئے ساری مالی ذمہ داریاں مردوں ہی سے متعلق رکھی گئی ہیں، مہر اسے ادا کرنا ہے، دعوت ولیمہ اس کی ذمہ داری ہے، پھر نکاح کے بابت لڑکی کی تمام ضروریات اس سے متعلق ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی ان مالی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اور الٹے لڑکی اور اس کے اولیا سے اپنی قیمت وصول کرتا ہے، تو یہ نہایت ہی شرمناک بات ہے، جوانی کی قیمت تو جانوروں کی لگائی جاتی تھی، اور اعلیٰ نسل کے جانور حاصل کئے جاتے تھے، کیا شادی کے موقع سے لڑکے والوں کی جانب سے مطالبہ اس حیوانی کردار کی پیروی نہیں ہے، اور جو لوگ پیسے لے کر شادی کرتے ہیں، کیا وہ مردانہ تعظیم ووقار اور بحیثیت شوہر تکریم وتوقیر کے مستحق ہیں؟ جب کہ قرآن نے مردوں کو بلند رتبہ اس بنیاد پر قرار دیا تھا کہ وہ خرچ کرتے ہیں، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونچا یعنی دینے والا ہاتھ نچلے یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، الید العلیا خیر من الید السفلی (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۲۹) تو جو شوہر اپنا ہاتھ نیچے رکھتا ہو اور اپنی بیوی اور اس کے اولیاء کو اپنا ہاتھ اونچا رکھنے پر مجبور کرتا ہو، وہ کیسے اپنی بیوی سے بلند رتبہ ہو سکتا ہے، اگر دولت مند خود فقیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے اور بادشاہ درویش کے سامنے اپنی کشکول رکھ دے، تو وہ فقیر ودرویش بلند مرتبہ ہوگا، یا بادشاہ وغنی؟

یہ ایک چبھتا ہوا ناگوار خاطر، لیکن برحقیقت سوال ہے، اور جن لوگوں نے اپنی اور اپنے بچوں کی قیمت لگا رکھی ہے، انہیں کبھی تنہائی میں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہئے، حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں، لیکن دانا وہی ہوتا ہے جو حقیقت کے تلخ گھونٹ کو اپنے حلق سے اتار لے۔

افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض لوگ لڑکیوں کی شادی کے وقت تو شریعت کی دہائی دیتے ہیں، لیکن لڑکوں کی شادی کے وقت شریعت کو بھول جاتے ہیں، بلکہ شریعت کا ذکر بھی گراں خاطر ہوتا ہے، گویا شریعت پر عمل کرنا مقصود نہیں ہے، اصل مقصود نفس کے عفریت کا پیٹ بھرنا ہے، اس لئے کبھی پیسے بٹورنے کے غرض سے شریعت کے نام سے گریز کیا جاتا ہے، اور کبھی پیسہ بچانے کے لئے شریعت کا نام استعمال کیا جاتا ہے، مقصود

دونوں صورتوں میں اپنے مالی مفادات کو حاصل کرنا ہے، ابھی چند دنوں پہلے حیدرآباد میں خواتین کی تنظیم تحفظ شریعت کمیٹی نے اپنے ۸ شعبہ'' وومن ہیلپ لائن'' کے تحت نفیس گارڈن میں ایک پروگرام رکھا تھا، جس میں شریعت اور سنت کے مطابق نکاح کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں اور ان کے اولیاء کو جو رشتہ کے خواہشمند ہوں، دعوت دی گئی تھی، تاکہ ایسے لوگ اس عزم کے ساتھ باہم رشتہ طئے کریں کہ وہ مسنون طریقہ پر بغیر لین دین کے تقریب نکاح کو انجام دیں گے، اس کیمپ کے افتتاح کی ذمہ داری اس حقیر پر رکھی گئی تھی، میں جب پہونچا تو اس وقت تک دوسو سے کچھ اوپر رشتہ کے خواہشمند حضرات اپنے نام رجسٹرڈ کرا چکے تھے، لیکن ان میں بیس رشتے لڑکے والوں کی طرف سے تھے، اور باقی سب لڑکی والوں کی طرف سے، گویا نوے فیصد رشتوں کی پیش کش لڑکی والوں کی طرف سے تھی، اور دس فیصد لڑکے والوں کی طرف سے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سماج کے مزاج میں کتنا بگاڑ آچکا ہے، اور شریعت اور دین کو کس قدر پس پشت ڈالدیا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کے موقع پر مہر کے علاوہ جو مطالبات کئے جاتے ہیں، وہ رشوت کے حکم میں ہیں، رشوت کا لینا تو حرام ہے ہی، شدید ضرورت کے بغیر رشوت کا دینا بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں جہنمی ہیں، اس طرح نکاح کے موقع سے مطالبہ کرنے والے تو اپنے لئے جہنم خریدتے ہی ہیں، اور اللہ کی لعنت کا طوق اپنے گلے میں لٹکاتے ہی ہیں، جو لوگ دینے پر مجبور نہ ہوں وہ بھی اپنے لئے جہنم اور خدا کی لعنت خرید رہے ہیں، مجھے تو سب سے زیادہ افسوس لڑکے کے بوڑھے والدین اور دوسرے اعزہ کی کم بختی پر ہوتا ہے، کہ زیادہ تر وہی مطالبات کی فہرست بتاتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں، حالانکہ جب یہ سامان گھر میں آتا ہے، یا رقم لڑکوں کے ہاتھوں ملتی ہے، تو خود ان کو بہت کم اس سے استفادہ کا موقع بہم پہونچتا ہے، زیادہ تر گھر میں آنے والی بہو اور اس کا شوہر ہی نفع اندوز ہوتا ہے، لیکن ناحق قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے والدین اپنے عمر

کے آخری لمحات میں جس کو توبہ واستغفار کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، دوزخ اور لعنت خداوندی بصد مسرت اور بہ ہزار شوق خرید کرتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کم نصیبی بلکہ بدنصیبی ہوسکتی ہے؟

اگر کسی شخص نے رشوت لے لیا ہو تو اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ وہ اسے واپس کردے، اس لئے جن لوگوں نے مطالبہ کے ذریعہ کوئی رقم یا سامان حاصل کیا ہے، تو اس کا یا اس کی قیمت کا واپس کردینا شرعاً واجب ہے، مانگنا چاہے صراحتاً ہو یا اشارۃً، براہِ راست ہو یا بالواسطہ سب کا ایک ہی حکم ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالبہ تو نہیں کیا اور سامان کی فہرست تو پیش نہیں کی لیکن کسی دولت مند گھرانہ میں یہ سمجھ کر رشتہ طے کیا کہ اگر دو نہیں تو ایک لاکھ تو کہیں نہیں جائیں گے، اتنا تو وہ بغیر مانگے ہی دے دے گا، یہ بھی رشوت کے ہی حکم میں ہے، کیوں کہ فقہاء نے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو چیز بطورِ شرط کے طے نہ کی جائے، لیکن عرف ورواج کے تحت لی جائے، تو وہ بھی شرط لگانے کے ہی درجہ میں ہوگا، المعروف عرفا کالمشروط شرعًا، ہاں! اگر انکار ونفی کے باوجود لڑکی والے اپنی طرف سے دیدیں تو یہ یقیناً اس دائرہ میں نہیں آئے گا۔

اگر نکاح کی تقریب مسجدوں، دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں رکھی جائیں، علماء اور اہلِ دین سے نکاح کے خطبات پڑھوائے جائیں، مجلس نکاح میں ایمان افروز اور روح پرور بیان رکھے جائیں، لیکن اندرونی طور پر سودہ بازی بھی کی جائے اور چھپے ہاتھوں لین دین کا معاملہ بھی طے کیا جائے، تو یہ تو نفاق اور گناہ پر ظاہری نیکی کا دبیز غلاف چڑھانا اور دین کے پردہ میں بے دینی کو چھپانا ہے، جو یقیناً کھلی ہوئی بے دینی سے بھی زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔

لین دین کا ایک نفسیاتی اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کوئی لڑکی مسنون طریقۂ عقد کے ذریعہ نکاح میں لائی جائے، تو لڑکی اور اس کے والدین کے اندر احسان مندی اور احسان شناسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنے سسرال کو اپنا محسن تصور کرتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک ماں باپ سے جدا ہو کر دوسرے ماں باپ کے گھر پہونچی ہے، اس میں اپنے

شوہر، ساس سسر اور سسرال کے بزرگوں کے تئیں محبت اور خدمت کے جذبات ہوتے ہیں، اور جب لڑکے اور اس کے والدین لڑکی والوں کا خون جگر اور آخری قطرۂ لہو نچوڑ کر اسے اپنے گھر لاتے ہیں، اس بہو میں احسان مندی اور جاں نثاری کے بجائے نفرت اور خودغرضی کے جذبات پنہاں ہوتے ہیں، اور یہ ایک فطری بات ہے، اگر کوئی شخص آپ کو پانچ روپیہ ہی کی کوئی چیز تحفۃً پیش کرے، تو آپ یقیناً اس کے شکر گذار ہوں گے، اور آپ کے دل میں قدر دانی کا جذبہ پیدا ہوگا، اور اگر آپ کسی سے پانچ روپے میں کوئی چیز خرید کریں تو آپ اسے محسن تصور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو محسن سمجھیں گے، اس لئے کہ تاجر خریدار کا احسان مند ہوتا ہے نہ کہ خریدار تاجر کا، اس لئے جس لڑکی اور اس کے سرپرست نے دلہا کی قیمت ادا کی ہے، آخر وہ اس مرد یا مرد کے اہلِ خانہ کے احسان مند کیوں کر ہو، جس کی قیمت ان لوگوں نے اپنا خون جگر بیچ کر ادا کی ہوں، اسی لئے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ جب بہو گھر میں آتی ہے وہ خدمت واطاعت کے جذبہ سے خالی و عاری ہوتی ہے، اور گھر سے متعلق فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہ۔

(۱۶ر اگست ۲۰۰۲ء)

عورتوں کا حق میراث

اسلام کا معاشی اور مالی نظام اس اصول پر مبنی ہے کہ ایک ہی شخص کے پاس دولت کا ارتکاز نہ ہو، دولت زیادہ سے زیادہ تقسیم ہوتی رہے تا کہ غریبوں اور دولت مندوں کے درمیان معاشی فاصلہ کم ہو، اور حد سے زیادہ دولت کی وجہ سے انسان کے اندر جو اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی شخص کے پاس دولت کے ارتکاز کی وجہ سے سماج کے ایک طبقہ میں احساسِ محرومی کی تشدد اور دہشت گردی کا جو رجحان نشونما پاتا ہے، اس کا سدِ باب ہو سکے، تقسیم دولت کا جو نظام اسلام نے بنایا ہے اس میں ترکہ و میراث کے قانون کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس میں خود اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے، اگر مرنے والا شخص اپنی دولت کو کسی ایک ہی وارث کے حق میں مرتکز کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔

اسلام سے پہلے دنیا کے مختلف مذاہب اور نظام ہائے قانون میں قانون میراث بہت ہی غیر متوازن تھا، بعض مذاہب میں صرف لڑکوں کو حصہ ملتا تھا، لڑکیاں میراث سے مرحوم تھیں، بعض مذاہب میں صرف پہلوٹھا بیٹا پورے متروکہ کا حق دار سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس ناانصافی اور بے اعتدالی کو ختم کر کے ایک نہایت متوازن اور عادلانہ نظام میراث عطا کیا ہے، جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی ترکہ کا حق دار بنایا گیا ہے، البتہ چونکہ دونوں کی مالی ذمہ داریوں میں تفاوت ہے، اس لئے دونوں کے حق میراث میں بھی فرق رکھا گیا ہے، اسی طرح ایک ہی درجہ کے قرابت داروں کے حقوق مساوی رکھے گئے ہیں، چنانچہ لڑکا بڑا ہو یا چھوٹا، دونوں کا موروثی حق برابر ہوگا۔

قانون میراث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فقہ اسلامی کے بنیادی ماٰخذ چار ہیں، :قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں پہلے تینوں ماٰخذ اصل ہیں، اور جن مسائل میں ان کی رہنمائی موجود نہ ہو، وہاں قیاس واجتہاد سے مدد لی جائے گی، میراث کا قانون وہ اہم قانون ہے کہ یہ براہِ راست قرآن وحدیث کی صراحتوں اور امت کے اجماع واتفاق سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء (آیت: ۱۱، ۱۲، ۱۷۶) میں تفصیل سے میراث کے احکام کا ذکر فرمایا ہے، نیز احکامِ میراث کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر متنبہ کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ باخبر ہیں اور حکمتوں سے واقف بھی'' فريضة من الله، إن الله كان عليماً حكيما'' (النساء: ۱۱) یعنی میراث کے احکام سراسر علم وحکمت پر مبنی ہیں، اس لئے چاہے تمہاری عقل اس کو مانے یا نہ مانے، اس پر عمل کرو، اور جان رکھو کہ یہی حکمت ومصلحت کے عین مطابق ہے!

آیت میراث جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی، وہ بھی نہایت اہم ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ باہر نکلے، ''اسواف'' نامی مقام پر ہمارا گذر ایک انصاری خاتون کے پاس سے ہوا، وہ اپنی دو لڑکیوں کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ ان کے والد غزوۂ اُحد میں آپ کے ساتھ شہید ہو چکے ہیں، اور ان کے چچا نے شہید کا کل مال ومتروکہ لے لیا ہے، ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اور صورتِ حال یہ ہے کہ جب ان کے پاس کچھ مال ہی نہ ہوگا تو کوئی شخص ان سے نکاح کو بھی تیار نہ ہوگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں فیصلہ فرما دیں گے، چنانچہ سورۂ نساء کی آیت نمبر گیارہ نازل ہوئی، آپ ﷺ نے ان خاتون کو اور ان یتیم لڑکیوں کے چچا کو طلب فرمایا اور ان سے کہا کہ شہید کے ترکہ کا دو تہائی ان دونوں لڑکیوں اور آٹھواں حصہ شہید کی بیوہ یعنی ان دونوں بچیوں کی ماں کو دے دو، اس کے بعد جو بچ جائے، وہ تمہارا ہے۔ (ابوداؤد: کتاب الفرائض)

آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے میراث کے حق داروں کا ذکر فرمایا ہے، اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ اگر متوفی

کے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہوں تو بیٹوں کا حصہ بیٹے کے مقابلہ نصف ہوگا، اگر صرف ایک بیٹی ہی وارث ہوتو پورے ترکہ کے نصف کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بیٹیاں ہوں، بیٹے نہ ہوں، تو فی لڑکی ترکہ کا ایک تہائی پائے گی، اسی طرح باپ کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا، کہ اگر متوفی صاحب اولاد رہا ہوتو ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اس کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں تو ترکہ کا دو تہائی باپ کا حق ہوگا اور ایک تہائی ماں کا، اور اگر متوفی کے کئی بھائی ہوں تو پھر ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی باپ کو، اگر شوہر لاولد ہوتو بیوی شوہر کے ترکہ میں چوتھائی کی حق دار ہوگی، اور شوہر صاحب اولاد ہے تو آٹھواں حصہ بیوی کا حق ہوگا، اگر کسی شخص کی وفات ہوئی، نہ اس کے والدین ہیں اور نہ اولاد صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو اسے ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا، اور ایک سے زیادہ ہیں جیسے ایک بھائی ایک بہن یا دو بھائی دو بہنیں، تو ایک تہائی ترکہ بھائی بہن میں برابر تقسیم ہوگا، سورۂ نساء کی آیت نمبر گیارہ بارہ میں ان احکام کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم ''وصیۃ من اللہ'' (آیت نمبر۱۲) قرار دیا گیا ہے، پھر ان احکام کی تاکید اور تقویت کے لئے ارشاد ہے:

> یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، تو جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے گا، اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ یہیں رہیں گے، اور یہی ہے بڑی کامیابی! اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے، اللہ اس کو دوزخ میں داخل کریں گے، وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا، اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ (النساء:۱۳،۱۴)

عورتوں میں بیوی، بیٹی، ماں اور بہن کے علاوہ پوتی، دادی، اور نانی بھی بعض اوقات میراث کی حق دار قرار پاتی ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، غرض اسلام میں عورتیں بھی میراث کی حق دار ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان میں مسلمانوں نے برادرانِ وطن سے جن غیر اسلامی طریقوں کو سیکھا اور ان کو گلے لگایا، ان میں سے ایک عورتوں

کو میراث کے حق سے محروم رکھنا بھی ہے، شوہر کے انتقال کے بعد نہ بیوی کو میراث دی جاتی ہے اور نہ اس بات کی فکر کی جاتی ہے کہ اگر بیوی کا حق مہر شوہر کے ذمہ واجب الاداء ہو تو پہلے مہر ادا کیا جائے پھر ترکہ کی تقسیم عمل میں آئے، حالانکہ مہر بھی دوسرے دین اور قرضوں کی طرح ایک قرض ہے، اور قرضوں کے ادائیگی کے بعد ہی بچی ہوئی جائداد سے وارثوں کا حق متعلق ہوتا ہے، قرآن نے احکامِ میراث میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے، پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس کو اس کے حقِ میراث سے بھی محروم کر دیا جائے، ایسی ہی زیادتی لڑکیوں کے حق میں بھی روا رکھی جاتی ہے، کہ پورے متروکہ پر لڑکے قبضہ کر لیتے ہیں، اور لڑکیوں کو ان کا حق ہی نہیں دیتے، بعض لڑکیاں تو نابالغ بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ان کو ترکہ سے محروم کر دینا دوہرے گناہ کا باعث ہے، ایک تو ناجائز طریقہ پر دوسرے کے مال پر قبضہ، یعنی غصب، اور دوسرے یتیم کا مال کھانا، اور یتیم کے ساتھ ظلم جیسا شدید گناہ ہے وہ ظاہر ہے۔

لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنے کا رواج اس قدر جڑ پکڑ گیا ہے کہ بعض خواتین اپنا حصۂ میراث طلب کرنے میں حیا اور حجاب محسوس کرتی ہیں، اور اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگے تو دوسرے اقرباء اور رشتہ دار بھی اسے عار دلاتے ہیں، اور اس کو دناءت اور خساست تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض دین سے ناواقفیت اور ناسمجھی کی بات ہے، حصۂ میراث ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں دیتا، بلکہ یہ عطیہ خداوندی اور قرآن کی زبان میں ''فريضة من الله'' ہے۔ اور اہلِ علم نے لکھا ہے کہ انسان کے لئے مال حاصل ہونے کے جتنے ذرائع ہیں، ان میں سب سے زیادہ حلال اور پاکیزہ ذریعہ یہی میراث ہے، اس لئے نہ میراث کے طلب کرنے میں تکلف کرنا چاہئے، نہ اس عمل کو باعثِ شرم خیال کرنا چاہئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے جس بات کو منع کیا ہے، اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے، نکاح کو آسان رکھا گیا ہے اور نکاح میں لڑکی اور اس کے اولیاء پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، لیکن ''گھوڑے جوڑے'' اور ''جہیز'' کے مطالبہ نے سماج کی کمر توڑ رکھی

ہے، اور لڑکی ماں باپ کے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے، اور جس چیز کا شریعت نے حکم دیا ہے یعنی حقِ میراث، اس سے ان کو محروم کیا جاتا ہے۔

پس، عورتوں کو حق میراث سے محروم کرنا اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے حصہ نہ دینا سخت گناہ اور ظلم شدید ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی بھی ہے، قرابت داروں کے ساتھ حق تلفی اور ناانصافی بھی، اور نہایت قبیح قسم کی حرام خوری بھی، حرام خوری ایسا گناہ ہے کہ یہ انسان کی عبادت کو ضائع کر دیتی ہے، اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں، انسان طرح طرح کی آفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، اس لئے کسی بھی طرح یہ مناسب نہیں کہ انسان دنیا کی متاع حقیر کے لئے دنیا اور آخرت کا اتنا بڑا خسارہ مول لے، اور جانتے بوجھتے نقصان کی تجارت کرے!!

(۲۶/فروری ۱۹۹۹ء)

نام —— قومی شناخت کا ایک اہم ذریعہ!

ہمارے ملک میں ایک تنظیم "راشٹریہ سیوک سنگھ" ہے، جس کا مخفف " آر، ایس، ایس" ہے، معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بہت پُرکشش ہے، گویا یہ قومی خدمت گاروں کا ایک گروہ ہے، لیکن اس کے عزائم اتنے ہی خطرناک اور انسانیت دشمن ہیں، یعنی اس تنظیم کا بنیادی مقصد ملک کی اقلیتوں پر جبر و دباؤ قائم رکھنا، اور ان میں عدم تحفظ کے احساس کو برقرار رکھنا ہے، گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے وہ اپنے ان مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہیں، اور امن کے نامۂ اعمال کے حرف حرف سے مظلوموں کے خون ولہو کی سرخی نمایاں ہے، کچھ عرصہ قبل جناب کے، سدرشن آر، ایس، ایس کے ذمہ دار منتخب ہوئے ہیں، وہ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد ہی سے ایسے گرم بیانات دے رہے ہیں جو اقلیتوں کو اشتعال میں لے آئیں، اور اس طرح فرقہ پرست عناصر کو اپنے مذموم عزائم کے روبہ عمل لانے کا بہانہ ہاتھ آ جائے، انہوں نے عیسائیوں اور سکھوں کے خلاف بھی ہرزہ سرائی کی ہے، لیکن مسلمان ان کا زیادہ نشانہ ہیں۔

ہفتہ عشرہ پہلے انہوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے نام میں اسلام کے ساتھ ہندو ناموں کو بھی جوڑا کریں، جیسے نعوذ باللہ "محمد رام" وغیرہ نام رکھا کریں، انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی، ان میں بہت سے مسلم حکمراں وہ تھے، جو اپنے سیاسی مسائل میں مسلمانوں کے مقابلہ ہندو بھائیوں کو قریب رکھتے تھے، اور جن مسلمان فرمان رواؤں کو آج یہ متعصب اور تنگ نظر کہتے ہیں، جیسے حضرت اورنگ زیب عالمگیر، بابر وغیرہ، ان کا بھی حال یہ تھا کہ

بڑے بڑے سیاسی اور فوجی عہدوں پر انہوں نے ہندو بھائیوں کو رکھا تھا، اگر اتنا طویل عرصہ میں مسلمان دوسری قوموں کو بالجبر مسلمان بنانے کی کوشش کرتے، یا کم سے کم مسلمانوں کے سے نام رکھنے کی ان سے خواہش کی جاتی، اور انہیں مجبور نہیں کرتے، صرف ان کو اس کی ترغیب ہی دیئے ہوتے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ اس ملک میں غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی ہوتی، ایک ایسی قوم جسے درختوں اور پتھروں یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کو بھی پوجنے میں عار نہیں، اور بے جان مظاہر قدرت کے سامنے سر ٹیکنے میں بھی کوئی حجاب نہیں، اس کے لئے انسانوں کا مطیع و فرماں بردار ہو جانا اور فرماں رواؤں کے سامنے سر جھکانا کیا دشوار ہوتا؟ لیکن مسلمانوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اور اپنے پیغمبر کی تعلیم کے مطابق مذہب کے معاملہ میں جبر و دباؤ کی راہ اختیار کرنے سے ہمیشہ اجتناب برتا، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو جناب سدرشن آج عبداللہ یا عبدالرحمان ہوتے ــــ یہ ہے مسلمانوں کی رواداری! اور دوسری طرف ہمارے یہ کوتاہ ذہن، تنگ نظر اور شدت پسند قائدین ہیں کہ جو صرف نصف صدی میں دوسری قوموں کو اپنے وجود میں جذب کرنے کے درپے ہیں، وہ بدھشتوں، سکھوں، اور جینوں کو ہندو کہتے ہیں، عیسائی مبلغین کو زندہ نذر آتش کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں رام اور کرشن کا خون ہے، اور تلقین کرتے ہیں کہ انہیں اپنے نام ہندوؤں کے سے رکھنے چاہئیں، کیا اس سے بھی بڑھ کر شدت پسندی اور مذہبی دہشت گردی کی اور مثال ہو سکتی ہے؟؟

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا شعور پیدا کیا ہے، اور وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ ایسے بیانات کا مقصد ان کو مشتعل کرنا اور بھڑکانا ہے، اگر وہ مشتعل ہو جائیں تو یہ بالواسطہ ان فرقہ پرستوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہوگا، چنانچہ مسلمانوں نے سدرشن صاحب کے ان بیانات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، اور سنی ان سنی کر دی، کسی بات کو اہمیت نہ دینا اور اس پر رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا بھی معاندین کا ایک جواب ہے، اور بعض اوقات یہ جواب زیادہ مؤثر اور کم نقصان دہ ہوا کرتا ہے، اور حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ مسلمان بہت سے مسائل میں

وہ طریقہ اختیار کریں جسے قرآن میں ''اعراض'' کہا گیا ہے۔

تاہم مسلمانوں میں یہ شعور ہونا چاہئے کہ وہ کسی بات کے دائرہ اثر کو سمجھیں اور محسوس کریں کہ اس بات کو قبول کرنے یا نہ کرنے میں ہمیں کیا نقصان اور فائدہ ہو سکتا ہے؟ تاکہ وہ جو بھی قدم اٹھائیں، وہ بصیرت سے بھرپور اور فراستِ ایمانی سے معمور ہو، ان کا بولنا بصیرت کے ساتھ بولنا ہو اور ان کا چپ رہنا بصیرت کے ساتھ چپ رہنا ہو، ____

نام اور قومی انتساب کی بڑی اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے مسلمانوں کو نام کے بارے میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں، اور سماجی مسائل میں اس بابت حدیث میں جتنی وضاحت ملتی ہے، شاید ہی کسی اور امر کی بابت اس قدر تفصیل و وضاحت ہو، آپ ﷺ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ بہتر نام رکھے جائیں، حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، اس لئے اچھے نام رکھا کرو، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۹۴۸) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، احب الاسماء الی اللہ تعالیٰ عبد اللہ و عبد الرحمن (ابوداؤد: ۴۹۴۹) یعنی ایسا نام جس سے اللہ تعالیٰ سے بندگی اور عبدیت کا رشتہ ظاہر ہو، کیونکہ یہ نام نہ صرف اس کی شخصیت بلکہ اس کے فکر و عقیدہ کا بھی ترجمان ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا نام مشرکانہ ہوتا، تو آپ ﷺ اس کا نام بدل کر ایسا نام رکھتے، جس سے بجائے شرک کے توحید کا اظہار ہوتا، ایک صاحب آئے، آپ ﷺ نے ان کا نام دریافت کیا، انہوں نے کہا: عبد العزیٰ، عزیٰ ایک بت کا نام تھا، زمانۂ جاہلیت میں لوگ اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے اپنا نام رکھتے تھے، آپ نے ان کا نام عبدالرحمان رکھا، (مجمع الزوائد: ۵۰/۸) مشرکین چونکہ جانوروں کی بھی پوجا کرتے رہے ہیں، اس لئے بعض لوگ اپنا نام جانوروں کی نسبت سے بھی رکھا کرتے تھے، چونکہ عبدالرحمان بن سمرہ کا نام ''عبد کلاب'' تھا، کلاب ''کلب'' کی جمع ہے، اور ''کلب'' کے معنی کتے کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بھی عبدالرحمان رکھا۔

(مجمع الزوائد: ۵۵/۸)

اور صرف مشرکانہ نام ہی پر منحصر نہیں، کوئی بھی ایسا نام جس سے غلط معنی پیدا ہوتا ہو، آپ اسے پسند نہیں کرتے تھے، ایک خاتون کا نام ''عاصیہ'' تھا، جس کے معنی نافرمان کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بدل کر ''جمیلہ'' رکھا، (ابوداؤد: ۴۹۵۲) حضرت علی ؓ نے حضرت حسنؓ حسینؓ کا نام حرب رکھنا چاہا، حرب کے معنی جنگ اور لڑائی کے ہیں، آپ ﷺ نے بجائے اس کے حسنؓ اور حسینؓ نام رکھے، (مجمع الزوائد: ۵۲/۸) ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو ''مسلم'' سے موسوم فرمایا، (مجمع الزوائد: ۵۲/۸) اس طرح کی بہت سی مثالیں حدیثوں میں موجود ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے انبیاء کے نام پر نام رکھنے کی ترغیب دی، تسموا باسماء الانبیاء، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۵) اور خود اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا، کیونکہ نام سے انسان کے ذہن میں خود اپنی شناخت اور پہچان پیدا ہوتی ہے، جس شخص کا نام انبیاءؑ، صحابہؓ اور اولیاء صالحینؒ کے نام پر ہو، اس کے ذہن میں ایک سوچ یہ ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اس کا فکری نسب ان بزرگوں سے ملتا ہے، اور وہ اپنے عقیدہ و ایمان میں ان اہل اللہ کا وارث ہے۔

اسلام میں ایک خاص قانون ''موالات'' کا ہے، اس قانون کے تحت اگر کوئی عجمی شخص کسی عرب مسلمان قبیلہ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تو وہ اسی قبیلہ کی طرف منسوب کیا جاتا، امام بخاریؒ ایرانی النسل تھے، لیکن اسی نسبت سے جعفی یمانی کہلائے، غور کیا جائے تو فقہاء کے استنباط کئے ہوئے اس قانون میں بہت ہی عمیق اور دور رس فکر کارفرما ہے، اور وہ فکر یہ ہے کہ انسان طبعی طور پر اپنے آباء و اجداد سے محبت رکھتا ہے، اور ان کی نسبت کو باعثِ افتخار جانتا ہے، اس لئے اگر مسلمان ہونے کے بعد بھی زمانۂ کفر کی خاندانی نسبت اس کے ساتھ لگی رہے، تو اس سماج سے وہ پوری طرح اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے گا، اور اگر کر بھی لے تو یہ اندیشہ باقی رہے گا کہ کل ہو کر جب حالات بدل جائیں، تو اس کی اگلی پشتیں پھر اپنے ماضی سے فکری رشتہ استوار کرنے کی کوشش کریں، لیکن جب وہ ایک مسلمان خاندان سے منسوب ہو جائے گا، تو اس کا سرمایۂ افتخار ایک ایسی خاندانی نسبت ہوگی، جو شروع سے مسلمان ہے، اور اس کا اندیشہ باقی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائے،

چنانچہ ایران، عراق، مصر وشام وغیرہ کا بہت بڑا علاقہ جو اسلام کے زیرِ نگیں آیا، وہ اس طرح اسلام سے وابستہ ہوگیا کہ ان کی تہذیب وثقافت پر کفر کی کوئی چھاپ باقی نہ رہ سکی، یہاں تک کہ ان کی زبان تک بدل گئی، برِصغیر کے بہت سے علاقوں میں راجپوتوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ یہ ایک بہادر قوم ہے، اور مسلمانوں میں پٹھان اپنی بہادری میں مشہور تھے، اس لئے انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد پٹھان کہلانا پسند کیا، اور آج ہند وپاک میں پٹھان خاندان کی بعض شاخیں وہ ہیں، جو اصل میں راجپوت تھے، لیکن اب ان میں اپنے راجپوت ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس باقی نہ رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصہ تک ان سے اسلام کی اور مسلمانوں کی حفاظت کی خدمت لی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب عربوں کے سامنے اسلام پیش کیا، تو یہ وہ دینِ حق تھا، جو حضرت آدم علیہ السلام سے آپ تک ہر دور میں آتا رہا، لیکن آپ ﷺ نے اس دین کے دینِ ابراہیمی اور اس ملت کے ملتِ ابراہیمی ہونے کی حیثیت کو زیادہ اُبھارا، اور اس پہلو کو اپنی تعلیمات میں اور اسلام کے نمائندہ تہواروں میں نمایاں فرمایا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف مشرکین عرب بھی آسمانی کتاب سے محروم ہونے کے باوجود اپنی نسبت کیا کرتے تھے، اور یہود ونصاریٰ بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وارث سمجھتے تھے، گویا جو تین قومیں آپ ﷺ کی دعوت کی اولین مخاطب تھیں، وہ سبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت کو اپنے لئے باعثِ صد اعزاز سمجھتی تھیں، اور آپ ﷺ کی تعلیمات تو اصل میں اسوۂ ابراہیمی ہی پر مبنی تھیں، اس لئے اس نسبت کی وجہ سے ان کو اسلام قبول کرنے میں کوئی عار نہیں تھی۔

ہندوستان کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان اور گجرات کے کچھ حصوں میں بہت سے ہندو خاندان صوفیاء کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے، لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنی سابقہ خاندانی نسبتوں کو بھی قائم رکھا، اور ٹھاکر، چودھری، ڈیسائی وغیرہ کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی اگلی نسلیں دین سے دُور اور علمِ دین سے محروم ہوئیں، اور لوگوں نے تحریص اور ترہیب کے ہتھیار استعمال کئے اور ان کو ان کی آبائی نسبت یاد دلائی تو بعض علاقوں میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا اور ان نسبتوں نے اس مذموم مہم

کو تقویت پہونچائی، انڈونیشیا اور اس علاقے کے بعض ممالک میں ایسے نام رکھے جاتے ہیں جن میں ہندوانہ اور عیسائی ناموں کی آمیزش ہوتی ہے، جس کا اثر وہاں ارتداد کی شکل میں ظاہر ہوا، ہندوستان میں بودھسٹ، جین اور بہت سے سکھ بھی ہندو ثقافت میں جذب ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ان کے نام برادران وطن کے سے ہیں، اس لئے خود ان کے ذہن میں ان کی شناخت باقی نہیں رہی، اس لئے نام کے مسئلہ کو کم اہم نہ سمجھنا چاہئے، اس سے اعتقادی، فکری، تہذیبی و ثقافتی اور لسانی شناخت متعلق ہے، جو قوم اپنے نام کی بھی حفاظت نہ کر سکے، اس کے لئے اپنی فکر اور اپنی تہذیب کی حفاظت تو اور بھی دشوار ہے، اور جس قوم کی اپنی کوئی فکر اور تہذیب نہیں ہوتی، اس کو دوسری قوم کے ساتھ جذب ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، اس لئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ محض نام رکھنے کی دعوت نہیں ہے، بلکہ اپنے دور رس اثرات کے اعتبار سے فکری و تہذیبی ارتداد اور اپنے وجود کو گم کر دینے کی دعوت ہے!

(۱۰؍ مارچ ۲۰۰۱ء)